خطیبِ اعظم

سید عطاء اللہ شاہ کی سرگزشت

تحریر و تحقیق

ڈاکٹر ساجد امجد

خطیبِ اعظم

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ساجد امجد

جنگِ آزادی میں اپنی شعلہ نوائی سے نئی روح پھونکنے والے سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی سرگزشت

دونوں بچے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ باری باری کمرے سے باہر جھانک کر بھی دیکھ لیتے تھے جیسے کسی کے جانے کا انتظار ہو یا آنے کا خوف۔ ان میں سے ایک ماموں تھا ایک بھانجا۔ دونوں ہم عمر تھے اس لیے رشتوں نے دوستی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ پڑھائی میں بھی ساتھ تھے، کھیل میں بھی ساتھ۔ کھیلنے کودنے کا موقع ملتا ہی کہاں تھا مگر بچپن، نشیب کے پانی کی طرح شرارتوں کے لیے مواقع ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔

"دیکھ تو آؤ، ابا چلے گئے؟"

"ان کی غصیلی طبیعت سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ ابھی دیکھ کر آیا تھا۔ دوبارہ گیا تو ضرور ڈانٹ دیں گے۔"

"اچھا، تم بیٹھو۔ اب کے میں دیکھ کر آتا ہوں۔ کہیں جانے والے تو تھے۔ شاید چلے گئے ہوں۔"

بچے نے ڈرتے ڈرتے باہر جھانکا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ دوڑتا ہوا آیا اور دوسرے بچے سے لپٹ گیا۔ مارے خوشی کے اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔

"ابا تو کب کے چلے گئے۔ اب تو گھر میں ان کی خوشبو بھی نہیں ہے۔"

"ہم نے خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔ تم پتنگ اور ڈور لے کر آؤ۔ میں چھت پر جا رہا ہوں۔"

"ایسی بھی کیا جلدی۔ ساتھ ہی چلتے ہیں" بچے نے کہا اور چارپائی کے نیچے گھس گیا جہاں اس نے پتنگ اور ڈور چھپائی ہوئی تھی۔ دونوں بچوں نے چھت پر پہنچتے ہی آسمان کا جائزہ لیا جیسے اڑنے کے لیے پر تول رہے ہوں۔ وہ خود تو کیا اڑتے، ان کی پتنگ ہوا میں بلند ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تارا بن گئی۔

ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ کہیں سے ایک اور پتنگ آسمان کا ماتھا چومنے کے لیے بلند ہوئی۔ دونوں کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے۔ جب تک حریف سامنے نہ ہو، جنگ کا لطف کیسے آئے۔ اب حریف سامنے تھا، پیچ لڑانے کا مزہ تھا۔

"پہلا پیچ میں لڑاؤں گا۔"

"دوسرا پیچ نہ ہو سکا تو؟"

"ایسا کبھی ہوا ہے؟"

"چلو ٹھیک ہے لیکن ذرا سنبھل کر۔ کہیں ناک ہی نہ کٹوا دینا۔"

"دیکھتے جاؤ، میں کرتا کیا ہوں۔"

بچے نے پتنگ کا رخ موڑا اور آہستہ آہستہ دوسری

الله
رسول
محمد

سنی۔ ادب و شعر کا چرچا دیکھا۔ مشہور شاعر شاد عظیم آبادی محلے میں رہتے تھے۔ گھر میں آنا جانا تھا۔ پالنے سے گود تک کا سفر روز طے ہونے لگا۔ چپکے چپکے شعروں کا رس بھی کانوں میں پڑنے لگا۔ تربیت کے کیسے کیسے انداز تھے جو اس کا خاموش بچپن اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور دل میں اتار رہا تھا۔

ایک دن مشیت کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ اس کی ماں کو اس کے پہلو سے اٹھا دیا۔ وہ ابھی چار سال کا تھا کہ اس کی والدہ ایک مختصر سی علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ماں کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہوں گے۔ اپنے لختِ جگر کے لیے کیا کیا سوچا ہوگا لیکن فطرت نے لالے کی حنابندی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

عطاءاللہ پڑھنے کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ انگریزی تعلیم کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عربی و فارسی گھر کی زبانیں تھیں۔ نانا اور نانی معلم بنے، باپ نے نگرانی کی اور یوں اس کی تعلیم کا آغاز ہو گیا۔

سید ضیا الدین کو قدرتی طور پر یہ شوق تھا کہ ان کا بیٹا کلامِ الٰہی حفظ کرے۔ یہ کارِ نیک انھوں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ کاروبار کے بعد جتنا وقت پس انداز ہوتا، عطاءاللہ کو قرآن پڑھانے میں صرف کرتے۔

عطاءاللہ کو دولتِ قرآنی ورثے میں ملی تھی۔ نانا اور باپ حافظ تھے۔ والدہ حافظہ تھیں۔ دینی ماحول میسر آیا پھر اس کا دامن کیسے خالی رہتا، اس نعمت سے اس کا سینہ بھی فیض یاب ہو گیا۔ شوق نے ایسا سماں باندھا کہ فجر کو قرآن پڑھنے کھڑا ہوتا، ظہر تک ختم کر لیتا۔

۞*۞

عطا اللہ شاہ کی عمر کا کارواں لڑکپن اور شباب کی سرحدوں کے درمیان خیمہ زن تھا کہ پٹنہ میں کویت کے ایک شخص محمد عمر عاصم کی آمد کی دھوم مچی۔ یہ شخص سلطان عبدالحمید، والیِ ترکی کے بچوں کو قرآن پڑھانے پر مامور تھا۔ سلطان سے کسی بات پر ناراض ہوا اور ہندوستان چلا آیا۔ سیاحت کرتا ہوا پٹنہ چلا آیا۔ اس کی قرأت نے پورے شہر کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کی آواز میں ایسی شیرینی اور سوز تھا کہ غیر مسلم بھی مسجد کے گرد جمع ہو کر حجازی لہجے میں اس کی تلاوت سننے پر مجبور ہو جاتے۔

عطاءاللہ نے جب اس قاری کی تعریف سنی تو شوقِ سماعت نے ہاتھ باندھ کر چلنے پر اصرار کیا۔ محمد عمر عاصم آج پھر موج میں آئے ہوئے تھے۔ حجازی دریا موجیں مار رہا تھا۔ مسجد میں سننے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ عطاءاللہ بھی ایک طرف بیٹھ گیا لیکن دل تھا کہ سینے کا پنجرہ توڑ کر نکلنے کے لیے بے تاب تھا۔ قرآن اس لب و لہجے میں بھی پڑھا جا سکتا ہے؟ وہ ایک ایک لفظ پر غور کرتا رہا۔ اتار چڑھاؤ، دیکھتا رہا۔ سب سن رہے تھے وہ جذب کر رہا تھا۔ اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ وہ ڈوبنے کے لیے نہیں، تیرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ سننے والے تو ہزاروں ہیں اس جیسا پڑھنے والا دوسرا نہیں۔ کیا میں اس لب و لہجے میں نہیں پڑھ سکتا؟ کیوں نہیں۔ پھر جلدی کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ لے ذہن سے فراموش ہو جائے۔ وہ جلدی سے اٹھا اور مسجد سے باہر نکل آیا۔ محمد عمر عاصم کی آواز بڑی دور تک اس کا تعاقب کرتی رہی۔ گھر پہنچنے تک یہ آواز اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔ وہ اس آواز کو اس حفاظت سے اپنے ساتھ لایا تھا جیسے بچے جگنو پکڑتے ہیں۔ لیکن کتنی ہی حفاظت کر لو، جگنو کی روشنی برقرار نہیں رہتی۔ یہی حال اس کا ہوا۔ وہ اس نووارد قاری کے انداز میں مشق کرنے بیٹھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ جگنو تو وہی ہے لیکن روشنی غائب ہے۔ کئی گھنٹے کی مشق کے بعد اتنا ہوا کہ اس انداز کی کچھ جھلک کہیں کہیں نظر آنے لگی۔ امید کی اتنی روشنی بھی بہت تھی۔ یہ احساس بھی بہت تھا کہ گلے کی حلاوت میں وہ محمد عمر عاصم سے کم نہیں۔

اب اس نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ جہاں کہیں موقع ملتا، وہ محمد عمر عاصم کی تلاوت سننے پہنچ جاتا اور پھر گھر آ کر اس کے لب و لہجے میں پڑھنے کی مشق کرتا۔ رفتہ رفتہ اسے کامیابی ملنے لگی۔ کبھی کبھی اسے آواز پر خود دھوکا ہونے لگتا کہ یہ میں ہوں یا محمد عمر عاصم۔

شوق ہو تو ایسا۔ اثر ہو تو ایسا، کشش ہو تو ایسی۔ قدم اٹھے نہیں اور منزل سامنے آ گئی۔ جھولی پھیلی نہیں اور بھر گئی۔ وہ گھر میں بیٹھا مشق کر رہا تھا۔ آواز بلند بھی تھی اور پُرسوز بھی۔

محمد عمر عاصم کسی کام سے نکلے اور اس کی دیوار کے نیچے سے گزرے۔ تلاوت کی آواز آئی مگر یہ کیا۔ میں تو یہاں ہوں پھر میرے لہجے میں یہ کون ہے جو قرآن پڑھ رہا ہے۔ ان کی قرأت دنیا سننے آتی تھی، وہ عطاءاللہ شاہ کی قرأت پر کان لگائے کھڑے تھے۔ انہیں اپنی جوانی یاد آ گئی۔ وہ پھر قرأت کی طرف متوجہ ہوئے۔ آواز تو قدرت نے خوب دی ہے۔ اگر ذرا تربیت ہو جائے تو لوگ مجھے بھول جائیں گے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ اتفاق سے سید ضیا الدین گھر پر ہی تھے۔ انھوں نے دروازہ کھولا۔ سامنے محمد عمر عاصم کھڑے تھے۔

"میرا نام محمد عمر عاصم ہے۔"
"حضرت، پٹنہ میں کون ہے جو آپ سے واقف نہیں۔ حیران تو میں اس بات پر ہوں کہ آپ اور میرے دروازے پر؟"
"شمع کا یہ پوچھنا ہی فضول ہے کہ پروانہ کیوں چلا آیا؟"
"حضرت، میں اب بھی نہیں سمجھا۔"
"آپ کے گھر سے ابھی تلاوت کی آواز آ رہی تھی، کون پڑھ رہا تھا؟"
"میرا بیٹا ہے۔ عطاءاللہ شاہ بخاری۔"
"میں اس سے مل سکتا ہوں؟"
"اوہ! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ ہم اب تک دروازے پر کھڑے ہیں۔ آیئے، اندر تشریف لایئے۔"
"نہیں، میں جلدی میں ہوں۔ آپ صاحب زادے کو بلا دیں۔"

"وہ ابھی حاضر ہوئے جاتا ہے" سیّد ضیاالدین نے کہا اور عطاءاللہ کو بلانے گھر میں چلے گئے۔

ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا خوبصورت خط و خال، سرخ و سپید چہرے کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ نیم آستین کا کرتا اور تنگ پائنچے کی شلوار۔ پاؤں میں معمولی سی چپل۔ سر پر ٹوپی۔

"یہ ہے میرا بیٹا!"

"برخوردار! قرآن پڑھنے کا حق ادا کرتے ہو مگر ایک آنچ کی کسر ہے" محمد عمر عاصم نے کہا پھر سیّد ضیاالدین سے مخاطب ہوئے "آپ اس بچے کو میرے پاس بھیج دیا کریں۔ اس کا مستقبل میں ایسا دیکھ رہا ہوں کہ میرے جانے کے بعد لوگ کہیں گے محمد عمر عاصم ابھی پٹنہ ہی میں ہے۔ یہ ابھی نقل کرتا ہے۔ میں اس نقل کو اصل بنا دوں گا۔"

"یہ تو میری اور اس نالائق کی خوش بختی ہو گی کہ اسے آپ کے دامن تربیت کا سایہ ملے۔"

محمد عمر عاصم نے دعائیں دیں اور اپنی راہ ہو لیے۔

عطاءاللہ کے شوق کو منزل مل گئی۔ وہ باقاعدگی سے استاد کی خدمت میں حاضری دینے لگا۔ عربی الفاظ کے تلفظ اور قرأت کے رموز و نکات سے واقفیت ہوئی تو اس کے گلے کی حلاوت نے سماعتوں میں شہد و شکر کے انبار لگا دیے۔

دامن تھا کہ لبالب بھر گیا تھا، شوق تھا کہ کم ہونے میں نہ آتا تھا۔ طبیعت میں اضطراب بھی تھا اور غصہ بھی۔ پٹنہ سے باہر نکل کر علم کے خزانے کھنگالنے کو جی چاہتا تھا لیکن والد کی سخت گیر طبیعت اسے صرف قرآن تک محدود رکھنا چاہتی

تعزیت نامے

سیّد عطاءاللہ شاہ بخاریؒ کی وفاتِ حسرتِ آیات پر مجھے بے حد صدمہ ہوا ہے۔ شاہ صاحب جنگِ آزادی کے زبردست مجاہد تھے۔ قدرت نے آپ کو علم و فصاحت کی نعمتیں ودیعت کی تھیں۔ موت نے ہم سے ایک عظیم شخصیت چھین لی ہے۔

(فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں)

یہ بڑی غم ناک خبر ہے۔ آج مسلمان ایک بہت بڑی شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ سیّد عطاءاللہ شاہ بخاریؒ اپنے وقت کے بہت بڑے خطیب تھے بلکہ یہ کہنا بالکل درست ہو گا کہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ان کی وفات نے ایک بہت بڑی جگہ خالی کر دی ہے۔

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

سیّد عطاءاللہ شاہ بخاریؒ اسلام اور آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔ ان کی پوری زندگی پُرخلوص قربانیوں کا ایک ایسا مُرقع ہے کہ خود ان کے بلند مرتبت رفیقوں میں ان کی مثال شاید ہی ملے۔

(مولانا غلام رسول مہر)

⚬✲⚬

تھی۔ ایک ہی اولاد تھی جسے مر مر کے پالا تھا۔ ایک لمحے کو خود سے جدا کرنے کا خیال تک نہ آتا تھا۔ عطاءاللہ کی جوانی ان قیود کی کب تک پروا کرتی؟

پہلی جنگِ عظیم کے آغاز کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اس نے بھی ایک لڑائی لڑی۔ والد کو کچھ بتائے بغیر وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ کچھ دن بنارس میں ٹھہرا اور پھر امرتسر کی طرف چل دیا۔

سر پر بھاری قسم کی ریشمین سبز پگڑی، اچکن، تنگ پائنچے کی شلوار اور بہاری طرز کی سرخ رنگ کی جوتی پہنے چھوٹا سا لوہے کا ٹرنک اٹھائے ہال بازار اور امرتسر میں سیّد اسداللہ شاہ بخاری کی دکان پر پہنچ گیا۔ یہ بزرگ اس کے رشتے داروں میں سے تھے۔ کبھی سن لیا تھا کہ امرتسر میں اسداللہ کی دکان ہے۔ کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ بزرگ بھی بھلا اسے کیا پہچانتے۔ قیافے سے اندازہ کر لیا ہو گا کہ

کوئی مسافر ہے۔
"میرا نام عطاء اللہ ہے۔ حافظ ضیاالدین کا بیٹا ہوں اور پٹنہ سے آیا ہوں۔"
"بس کر پتر بس کر۔ میں سمجھ گیا۔ تو تو اپنا ہی خون ہے۔ مجھے پہلے ہی شک پڑا تھا کہ جوان کوئی خاندانی ہے۔ آ' بیٹھ اِدھر۔ ہور سنا کیسا ہے تیرا باپ؟"
"ایک بات اور بتانے سے رہ گئی ہے" عطاء اللہ نے کہا "میں اباجی کی اجازت کے بغیر آیا ہوں۔"
"او نہیں وے۔ او کیوں' سمجھ گیا.... وہ غصے کا تیز ہے' کچھ کہہ دیا ہوگا۔"
"نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ میں یہاں پڑھنے آیا ہوں۔"
"اوئے تیری عمر تو کمانے کی ہے۔ تو پڑھنے آیا ہے؟ میں تو سمجھا تھا' یہاں روزگار ڈھونڈنے آیا ہے؟"
"مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ حافظہ تو کرلیا ہے۔ عربی' فارسی بھی جانتا ہوں۔ اب کوئی اچھا استاد مل جائے تو دین کا علم پڑھوں گا۔"
"اس کا بھی انتظام ہوجائے گا' تو تھکن اتار۔"
رہائش کا بندوبست بھی ہوگیا تھا۔ کسی اچھے استاد کے میسر آجانے کی بھی امید تھی اور اسے کیا چاہیے تھا۔ دو چار دن گھوم پھر کر شہر کے گلی کوچوں سے واقف ہوتا رہا۔ جب جی بھر گیا تو آنکھیں بھر آئیں۔ جس کام کے لیے آیا تھا وہ تو ابھی ہوا ہی نہیں۔ اس نے پھر اسد اللہ شاہ بخاری سے کہا۔
"اچھا بھئی' آج ہم تجھے سیّد پیر شاہ بخاری کے پاس لے کر چلیں گے' جانتا ہے نا انہیں؟"
"نہیں۔"
"یہی تو ہے آج کل کے لڑکوں کا معاملہ۔ اوئے' تیرے باپ کے چچا ہیں وہ۔"
"وہ تو ہیں لیکن ان کا میری تعلیم سے کیا تعلق۔ مجھے ان کے پاس کیوں لے جا رہے ہو؟"
"میں نے ان سے تیرے لیے کہہ رکھا تھا۔ اب تک وہ تیرے لیے کچھ نہ کچھ سوچ چکے ہوں گے۔"
یہ بزرگ بھی اس سے نہایت تپاک سے ملے۔ انہیں اپنا وعدہ یاد بھی تھا اور وہ انتظام کر بھی چکے تھے۔ اسی وقت اٹھے اور اسے ساتھ لے کر امرتسر کے مشہور عالم مفتی غلام مصطفیٰ کے پاس لے گئے۔
مفتی غلام مصطفیٰ کڑا کمہاراں کی مسجد کے خطیب تھے اور مدرسہ نصرت الحق میں مُدّرسی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنے مدرسے میں تھے کہ سیّد پیر شاہ بخاری' عطاء اللہ کو لے کر پہنچ گئے۔
"آؤ سیّد بادشاہ' کیسے آنا ہوا؟ اور یہ صاحب زادے؟"
"یہی ہے میرا پوتا جس کے لیے میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔"
"اچھا' یہ ہیں وہ ذات شریف' کیا نام ہے تمہارا؟"
"سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری۔"
"سنا ہے حافظ بھی ہو؟"
"جی۔"
"کوئی رکوع سناؤ۔ اندازہ تو ہو کتنی محنت لوگے۔"
عطاء اللہ شاہ نے مدنی لہجے میں تلاوت شروع کی تو مفتی صاحب نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا جیسے انہیں اپنی سماعت پر یقین نہ آرہا ہو۔ مدرسے کے درودیوار پر وجد کا عالم طاری تھا۔ ایک ایک لفظ اشرفیوں میں تل رہا تھا' فرشتوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ جب تک وہ پڑھتا رہا' دونوں بزرگ سانس لینا بھول گئے۔
"میاں صاحب زادے' کس سے سیکھی ایسی قرأت؟"
"محمد عمر عاصم نامی ایک کویتی بزرگ سے۔"
"یہی تو میں سوچ رہا تھا۔ یہ ہندوستانی لہجہ ہے ہی نہیں۔ سکھانے والے نے دیا بھی خوب اور سیکھنے والے نے لیا بھی خوب۔ میاں' جہاں بھی پڑھوگے سننے والوں کا مجمع لگ جائے گا۔"
یہ تعارف ایسا تھا کہ مرید نے مراد کی شکل اختیار کرلی۔ مفتی صاحب نے اپنی کسی نیکی کا پھل سمجھ کر اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سیّد پیر شاہ بخاری بھی سرخرو ہوئے۔
مفتی صاحب اہل تقویٰ میں سے تھے۔ مردِ مومن کی نگاہ پائی تھی۔ زبان میں اثر تھا۔ کتابیں کھول کر سامنے رکھیں تو عطاء اللہ کے دل کے دروازے کھلتے چلے گئے۔
مفتی صاحب جمعے کا خطبہ دینے مسجد تشریف لے جاتے تو عطاء اللہ بھی ردیف بن کر ان کے ساتھ ہوتا۔ مفتی صاحب شعلہ بیان مقرر تھے۔ عطاء اللہ چپکے چپکے ان کی تقریروں کو اپنے اندر اتارتا رہا۔ علم کا دریا کہاں ٹھاٹھیں مارتا ہے' کہاں سر جھکا کر چلتا ہے۔ پہاڑی پتھروں سے ٹکراتا ہے تو کیسی آواز نمودار ہوتی ہے۔ کھلے میدانوں میں دوڑتا ہے تو کیا انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ فنِ تقریر کے رموز خود بخود سیکھتا چلا گیا۔
اسے کتابوں کی دنیا میں گم ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ وہ جب اس شہر میں آیا تھا تو بنی نوع انسان کی تباہی کے نشانات ابھر رہے تھے۔ سیاسی فیصلوں نے ہندوستان کو مرگ و زیست

کے دور اہے تک پہنچادیا تھا۔ اسلحہ ساز، ایشیائی اقوام کی ہلاکت آفرینیوں کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اب یہ چنگاریاں شعلہ بن گئی تھیں۔ یورپ کی مہذب قومیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہی تھیں۔ جنگ کے بادلوں نے گرجنا شروع کردیا تھا۔ غلامی کے شکنجے کسی بھی وقت مزید شدید ہوسکتے تھے۔ خطروں کی اس بھیڑ میں سیّد ضیاالدین کی شفقتِ پدری نے جوش مارا۔ نہ جانے کس وقت کیا ہوجائے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ امرتسر میں ہے اور محفوظ ہاتھوں میں ہے لیکن اب حفاظت کی کسی دیوار کا بھروسا نہیں تھا۔ سیاسی الاؤ دہک رہا تھا۔ ایجی ٹیشن اور جلسوں کی بھرمار تھی۔ امرتسر میں بہت خطرے ہیں۔ اب عطااللہ شاہ کو وہاں نہیں رہنا چاہیے۔ تیئس سال کا جوان، کسی بھی سیاسی تحریک میں شامل ہوسکتا ہے۔ انہوں نے سوچا اور ایک دن امرتسر پہنچ گئے۔

"میں تجھے لینے آیا ہوں۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"اباجی، آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔"

"تو مجھے بتائے بغیر یہاں چلا آیا تھا۔ میں اس وقت چپ رہا لیکن اب میں تیری ایک نہیں سنوں گا۔"

"اباجی، پٹنہ میں کیا رکھا ہے؟"

"ہم پٹنہ نہیں اپنے گاؤں ناگڑیاں جائیں گے جہاں ہمارے باپ دادا دفن ہیں۔"

"وہاں بھی کیا رکھا ہے؟"

"پتر، وہاں میں نے تیرے لیے لڑکی دیکھ رکھی ہے۔ تیری شادی کروں گا۔"

"پھر تو میری تعلیم بالکل ہی ادھوری رہ جائے گی۔"

"بہت عمر پڑی ہے۔ پڑھ لینا۔ دنیا کے حالات بہت خراب جارہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں، تیری شادی ہوجائے۔"

اس نے مٹھیاں بھر بھر کے دلیلوں کے روپے لٹادیے لیکن باپ کی ضد نے ہر بہانے کو کاغذ کی ناؤ کی طرح بہا دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس نے کتابیں بند کردیں۔ اب تک وہ صرف و نحو اور فقہ کی کتابوں کی تکمیل کرچکا تھا کہ امرتسر سے نکلنا پڑا۔ اس سفر میں اگر کوئی دلکشی تھی تو وہ یہ کہ وہ پٹنہ نہیں اپنے گاؤں ناگڑیاں، ضلع گجرات جارہا تھا۔

گجرات سے تقریباً پندرہ میل کشمیر سے ملحق پہاڑ کے دامن میں یہ مختصر سی تاریخی بستی مہاراجا اشوک کے دور میں "ناگئی" کے نام سے مشہور تھی۔ بعد میں کسی وقت یہ نام بگڑ کر ناگڑیاں بن گیا۔ مہاراجا گلاب سنگھ کے زمانے ۱۸۴۴ء میں کشمیر کے چند مسلمان گھرانے یہاں آکر آباد ہوگئے۔ عطااللہ شاہ کا گھرانا بھی انہی میں سے ایک تھا۔

لہلہاتے کھیتوں کے کنارے قدیم وضع کے کنوؤں کو دیکھ کر عطااللہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ گاؤں کے پیڑوں نے اس کا استقبال کیا۔ گاؤں کے گھبلے جوان ان باپ بیٹوں کو دیکھنے کے لیے جمع ہوگئے تھے۔ ان جمیلوں سے گزر کر وہ گھر پہنچا۔ گھر تو ماں سے ہوتا ہے۔ ماں کو تو یہاں تک آنے کی فرصت ہی نہ مل سکی۔ اب تو یہ گھر اس کے چچا کا تھا۔ انہی کی بیٹی سے اس کی شادی طے ہوئی تھی۔

گاؤں کی شادی ہی کیا۔ بڑی بوڑھیوں نے دعاؤں کے ساتھ سہاگ کے گیت گائے۔ بڑے بوڑھے آنگن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے لیے تخت بچھ گیا۔ اسی تخت پر نکاح ہوگیا۔

گاؤں میں اسے کوئی مولوی صاحب کہہ رہا تھا، کوئی حافظ جی کہہ کر پکار رہا تھا۔ ہر طرف اس کے علم اور قرآن پڑھنے کی دھوم مچ گئی۔ گاؤں کی مسجد کے دروازے اس کی امامت کے لیے کھلے ہوئے تھے لیکن اس کی تو منزل ہی کوئی اور تھی۔

۱۹۱۵ء کا سال یورپ کی لڑائی کا دوسرا سال تھا کہ وہ اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کرنے کے لیے ناگڑیاں سے نکلا اور امرتسر پہنچ گیا۔ حسنِ شباب عروج پر تھا۔ بڑی بڑی چمک دار آنکھوں پر کشادہ پیشانی بہار دکھارہی تھی۔ بدن پہلے سے زیادہ مضبوط ہوگیا تھا۔ چہرے پر خوشی کی جگہ وقار نے لے لی تھی۔

استاد کے مدرسے میں یوں قدم رکھا جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں۔ استاد کی نظرِ التفات نے اس کے وجود کا طواف کیا۔ اندیشوں کی موت ہوئی یقین کو زندگی ملی۔

"مجھے معلوم تھا، تم ضرور آؤ گے۔"

"آدمی کتنے دن بھوکا پیاسا رہ سکتا ہے؟"

"یہی لگن رہی تو تم بہت جلد اعلیٰ مراتب حاصل کروگے۔"

وہ استادِ گرامی کے درس میں پھر سے شریک ہوگیا۔ کتابوں کے صفحے ایک مرتبہ پھر ماہ و سال بن کر الٹنے لگے۔ جذبے سچے ہوں تو منزلیں قریب آنے لگتی ہیں۔ استاد کے دل میں ایسی محبت بے دار ہوئی جس سے اعتماد کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔

کتابوں کا علم اس کے ذہن کی تشفّی کے لیے محبت تھا لیکن اس کی روح ابھی تک تشنہ تھی۔ مفتی غلام مصطفیٰ اس کے ذہن کے دریچے کھول سکتے تھے لیکن اس کی روح میں کون

جھانک کر دیکھتا۔ اس کی گرہیں کون کھولتا۔ اس نے اپنی روحانی تربیت کے لیے حضرت پیر مہر علی گولڑہ شریف کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ ان سے بیعت کے بعد اس کی حالت اس بیمار کی طرح ہو گئی جسے اچانک قرار آجائے۔

استاد کا اعتماد برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ اس اعتماد نے ایسا رنگ دکھایا کہ استاد نے اس کی طرف کمالِ شفقت سے دیکھا اور اس کے لیے اپنی نشست خالی کر دی۔

"آج سے تم جمعہ پڑھایا کرو گے۔"

"میں کیا اور میری تقریر کیا۔"

"اس لیے تو کہہ رہا ہوں۔ تقریر کے اونچ نیچ سے واقف ہو جاؤ گے۔ میں نگرانی کے لیے موجود ہوں۔"

"یہ ذمے داری تو بہت بڑی ہے لیکن آپ کا حکم ٹال نہیں سکتا۔"

یہ اس کا انکسار تھا جو بول رہا تھا ورنہ وہ تقریر کرنے کھڑا ہوا تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے عمر گزاری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں۔ درمیان میں جب اس نے قرآنی آیات، مدنی لہجے میں تلاوت کیں تو ہر دنیاوی نغمے نے دم توڑ دیا۔ لوگ جھوم رہے تھے اور سبحان اللہ کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ نماز پڑھانے کھڑا ہوا تو نمازیوں کی آنکھوں کے کٹورے چھلک گئے۔ ایسی لذتِ ایسے کیف سے ان کا سابقہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔

اس کی شہرت عام ہونے میں اتنی دیر بھی نہیں لگی جتنی کلی کو پھول بننے میں لگتی ہے۔ گلی محلے اس کی شہرت سے پٹ گئے۔ ذوقِ سماعت نماز کی چند رکعتوں سے نہیں بہل سکتا تھا۔ وسعتِ بیاں کے لیے کچھ اور بہانے درکار تھے۔ لوگ چندہ... جمع کر کے شبینوں کا اہتمام کرنے لگے۔ آج اس گلی میں کل اس کوچے میں۔ اس کی آواز رات کے سناٹوں میں گونجتی رہی۔

مسجد کی کشادگی، تنگیٔ دامن کا سماں پیش کرنے لگی تھی۔ خلقت اس کثرت سے جمع ہوتی کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ آخر لوگوں نے مفتی غلام مصطفیٰ کو مجبور کیا کہ شاہ جی کو کھلے میدان میں تقریر کرنے کی اجازت دیں۔ یہ اس کی پہلی تقریر تھی جو اس نے کھلے میدان میں کی۔

اس تقریر کو سننے والوں میں مفتی غلام مصطفیٰ کا ایک معتقد سیّد گلاب شاہ بھی تھا جو محض تقریر سننے کے لیے اپنی بستی سلطان ونڈ سے امرتسر آیا تھا۔ تقریر کیا تھی، دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی والا معاملہ تھا۔ سیّد گلاب شاہ کو یہ افسوس تھا کہ وہ اکیلا کیوں آیا، پوری بستی کو ساتھ لے کر کیوں نہیں آگیا تاکہ وہ سب بھی سن لیتے۔ پھر اس نے سوچا، بستی یہاں نہیں آسکتی لیکن شاہ جی تو وہاں جا سکتے ہیں۔ وہ مفتی غلام مصطفیٰ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"حضور! آپ مجھے اپنے شاگرد شاہ جی کو میرے ساتھ سلطان ونڈ جانے کی اجازت دے دیں۔ ایک تقریر ان کی وہاں بھی ہو جائے۔"

"بھئی، میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ پیدا ہی اسی لیے ہوئے ہیں۔ اگر وہ تیار ہیں تو بے شک انہیں لے جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے بلکہ میں بھی ساتھ چلوں گا۔ اپنے لگائے ہوئے پودے کی بہار دیکھنے ہی کے لیے تو زندہ ہوں۔"

یہ تقریر ان کی وہ پہلی تقریر بن گئی جو انہوں نے امرتسر سے باہر کہیں کی۔ سلطان ونڈ کے باسیوں پر بھی ان کی تقریر کا وہی اثر ہوا جس سے امرتسر کے رہنے والے دوچار تھے۔

وہ تعریفوں کے تحفوں سے لدے پھندے امرتسر واپس آئے تو ہر دل میں ان کے لیے احترام کی شمعیں روشن تھیں۔ لوگ ادب سے شاہ جی اور سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے نام سے یاد کر رہے تھے۔ ہر شخص ان کا دعوے دار ہر دل ان کا طلب گار تھا۔

ایک دن کوچۂ جیل خانہ کے عوام ایک وفد کے ہمراہ مفتی غلام مصطفیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ درخواست یہ تھی کہ عطاء اللہ شاہ بخاری کو ان کی مسجد کی امامت کے لیے دے دیا جائے۔ استاد کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ ان کا شاگرد مسلسل سفر میں تھا۔ انہوں نے بہ خوشی اس درخواست کو قبول کر لیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ عطاء اللہ شاہ بخاری بھی رکنے والا نہیں۔

شاہ جی کے پہنچتے ہی کوچۂ جیل خانہ مسجد کی وسعتیں محدود ہو گئیں۔ محلے کی چھتوں تک پر ان کا وعظ سننے والوں کے ٹھٹ لگنے لگے۔ لاؤڈ اسپیکر کا رواج نہیں تھا لیکن ان کی پاٹ دار آواز دلوں اور کانوں کو مطمئن کرتی رہی۔

ان کے استاد مفتی غلام مصطفیٰ نے ٹھیک کہا تھا۔ انہیں ایک جگہ رکنا نہیں تھا۔ امرتسر کے کئی برس کے قیام نے ان پر یہ حقیقت روشن کر دی تھی کہ یہاں کے مسلمانوں میں ایسی رسمیں عام ہیں جن کا مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں جبکہ سادہ لوح عوام انہیں مذہبی رسوم سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ ان کا اپنا مشاہدہ بھی یہی تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں نے اس طرف توجہ دلائی اور شاہ جی نے یہ تہیّہ کر لیا کہ وہ ان قبیح رسموں کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ مسجد کی محرابوں سے اٹھنے والی آواز چند لوگوں تک پہنچ سکتی تھی۔ انہوں نے محلّہ وار تقریروں کا آغاز کر دیا۔ ان کی سادہ مگر پُراثر تقریروں نے

ڈھول کے پول کھولنے شروع کر دیے۔ وہ جس محلے میں چلے جاتے' انسانوں کا سمندر انہیں دیکھنے چلا آتا۔ جلسے میں شامل ہونے والے افراد ان کے ہم خیال ہو کر اٹھتے۔ ان کی کہی ہوئی باتیں دوسروں تک پہنچاتے۔ اس طرح شہر کے اندر ایک نئی تحریک نے جنم لے لیا۔

وہ علمائے سُوء جن کے رزق کا انحصار انہی رسموں پر تھا' تعداد میں کم سہی لیکن جمع ہونے کے لیے بہت تھے۔ ان سب نے اتحاد کیا اور شاہ جی کے خلاف محاذ بنالیا۔

ابھی یہ مخالفت پر پرُزے نکال ہی رہی تھی کہ اس سے بڑے مسائل سامنے آ گئے۔ سیاسی افق پر سرخ آندھی چلنے لگی۔ جو چنگاریاں چپکے چپکے جل رہی تھیں' شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں۔ امرتسر ان شعلوں کا خاص طور پر نشانہ بنا۔ ان آندھیوں کو روکنے کے لیے ہندو اور مسلمانوں کو ایک ہونا پڑا تو پھر شاہ جی اور ان کے مخالف علما کی مخالفت کتنی دیر سانس لیتی۔

جنگِ عظیم کا خاتمہ ہوتے ہی اتحادی طاقتیں فتح کے نشے سے چوُر ہو گئیں۔ وہ یہ بھول گئیں کہ انہوں نے ہندوستانیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ان سے کچھ وعدے کیے تھے۔ ان وعدوں میں ایک وعدہ' ہندوستان میں ہندوستانیوں کو ایک ذمے دار حکومت دینے کا تھا۔ جب انہیں وعدہ یاد دلایا گیا تو نتیجے میں مارشل لاء' تشدد' رولٹ ایکٹ' جبر اور پابندی دی گئی۔ لہٰذا پورے ملک میں انگریز حکمرانوں کے خلاف وعدہ شکنی کی آہ بھڑک اٹھی۔ ہندو' مسلم دونوں انگریز حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

شاہ جی ممکن ہے اب بھی محض مذہبی واعظ بنے رہتے۔ پیدائش سے موت تک کی رسموں پر تقریریں کرتے رہتے۔ سیاسی الاؤ کو دور سے دیکھتے رہتے لیکن جب گھر کی دیواریں آگ پکڑلیں تو آدمی کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ جب پانی سر سے اونچا ہو جائے تو کون ہے جو ہاتھ پاؤں نہیں چلائے گا۔

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو پورا امرتسر خون میں نہا گیا۔ شہری اپنے رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے جلیانوالہ باغ میں جمع ہوئے تو جنرل ڈائر نے ان پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ کسی قصور کے بغیر محض اس لیے کہ وہ ہندوستانی تھے' انہیں گولیوں سے بھون دیا گیا۔ پانچ سو سے زائد بے گناہ ہندوستانی موت کی نیند سلا دیے گئے۔

عطاءاللہ شاہ بخاری اب تک لاشوں کو کفن دیتے رہے تھے۔ ان کی نماز جنازہ پڑھاتے رہے تھے۔ انگریزوں کے مظالم کی داستانیں سنتے رہے تھے۔ اب انہوں نے اپنی آنکھوں سے بے گور و کفن لاشوں کو دیکھا۔ کب کا غصہ جو دبا ہوا تھا ابل پڑا۔ فوجی بوٹوں کی دھمک انہوں نے اپنے سینے پر محسوس کی۔ رگوں میں دوڑنے والا صالح لہو انتقام کی راہیں تلاش کرنے لگا۔

امرتسر (گول باغ) میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ عطاءاللہ شاہ بخاری' مسجد کے منبر سے اٹھے اور گول باغ پہنچ گئے۔ انتقام کو آواز ملی۔ دیوانگی نے پیچ و تاب کھائے۔ غصے کو لہجہ ملا۔ شعلہ بیانی نے وہ اثر دکھایا کہ تالیوں کی گونج سے قلعۂ افرنگی کی دیواروں میں دراڑیں پڑتی نظر آنے لگیں۔ مولانا محمد علی جو ہر بے اختیار ہو کر اٹھے اور اس نئے دیوانے کو خوش آمدید کہا۔ یہ عطاءاللہ شاہ کی پہلی سیاسی تقریر تھی۔

ان دنوں سارے ملک میں خلافت کمیٹیاں قائم کی جا رہی تھیں۔ لاہور میں بھی بعض سربر آوردہ لوگوں نے کمیٹی کی بنیاد رکھی لیکن گورنر پنجاب جنرل سر مائیکل اڈوائر کے حکم پر یہ کمیٹی توڑ دی گئی۔ یہ چہ میگوئیاں بھی ہونے لگیں کہ لاہور میں خلافت کمیٹی قائم نہیں ہو سکتی۔ کس میں دم تھا جو جنرل اڈوائر سے ٹکرا لیتا۔ عطاءاللہ شاہ بخاری کے شباب نے کروٹ لی۔ جوشِ جنوں نے پاؤں پھیلائے تو وہ لاہور میں تھے۔ لاہور کے لوگ ابھی تک ان سے نا آشنا تھے۔ وہ تو بس یہ دیکھ رہے تھے کہ ایک نوجوان ہے جو سر پر کفن کی طرح پگڑی باندھے ہوئے ہے۔ ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا ہے۔ اس کے مضبوط ہاتھ فرنگی سامراج کے گریبان تک پہنچنے کے لیے بے چین ہیں۔ آنکھوں میں ایسی چمک ہے کہ جس کی طرف غور سے دیکھتا ہے' وہ خوف کی لہر اپنے بدن میں محسوس کرتا ہے۔

موچی دروازے کے شمال کی جانب باغ میں دن کے گیارہ بجے جلسے کا اعلان کیا گیا۔ وہ خاموش اور سہمے ہوئے لوگ جنہوں نے پہلے خلافت کمیٹی بنائی تھی اور پھر توڑنے پر مجبور ہوئے تھے' اس جلسے کے انتظام میں پیش پیش تھے۔ نہ اسٹیج تھا نہ حاضرین۔ گورنر کے خوف سے لوگ آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ بہ مشکل تین چار سو کے قریب حاضرین جمع ہوئے۔ ان میں بھی بیشتر تماشائی اور راہ گیر تھے۔

شاہ صاحب نے اپنی مسحور کن آواز میں تلاوت شروع کی۔ ایک گھنٹے تک اللہ کا کلام فضا میں گونجتا رہا۔ پرندے پر ہلانا بھول گئے' لوگ بے خود تھے۔ بے خودوں کو ہوش میں بھی تو لانا تھا۔ شاہ جی نے تلاوت روک کر تقریر شروع کر دی۔ اسی اُثنا میں ظہر کا وقت ہو گیا لہٰذا وقفہ کر دیا گیا۔

نماز کے بعد جلسے کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی۔ اب حاضرین کی تعداد کچھ بڑھ گئی۔ عصر کی نماز کا وقت ہوا۔ نماز کے بعد جلسہ شروع ہوا تو حاضرین کی تعداد پانچ ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ شاہ جی آیات پڑھ رہے تھے اور تفسیر کرتے جاتے تھے۔ لوگ اس طرح بیٹھے تھے جیسے یہیں بیٹھے رہیں گے۔ ڈنڈے والے پیر کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

مغرب اور عشا کی نماز کے بعد جلسہ شروع ہوا تو جلسہ گاہ میں بیس ہزار لوگ جمع ہو چکے تھے۔ خوف کی دیواریں زمیں بوس ہو چکی تھیں۔ لوگ جوق در جوق جلسہ گاہ کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ عطاءاللہ شاہ بخاری گرج رہے تھے۔

"کون ہے جو کہتا ہے لاہور میں خلافت کمیٹی نہیں بن سکتی۔ میں کہتا ہوں کس مائی کے لال میں ہمّت ہے کہ اسے توڑ کر دکھائے۔"

اسی جلسے میں صدر اور جنرل سیکریٹری کا انتخاب بھی عمل میں آ گیا۔ چندے کی اپیل ہوئی تو نوٹ بارش کی طرح برسنے لگے۔ آخر انہیں اعلان کرنا پڑا کہ میں کہاں تک حساب رکھوں گا۔ آپ اس وقت چندہ نہ دیں۔ کل جب خلافت کمیٹی کا دفتر قائم ہو جائے گا تو رسید وصول کر کے چندہ دیں۔"

ان کی تقریروں نے حکومت کے ایوانوں میں آگ لگا دی۔ یہ عالم تھا کہ اگر وہ رات کو دن کہہ دیں تو مجمع بھی رات کو دن کہنے لگتا۔ جس شہر میں جا نکلتے، میدان تنگ پڑ جاتے۔ جس گھر میں ٹھہر جاتے، خلافت کمیٹی کا دفتر کھل جاتا۔ ان کی کوششوں سے صرف ضلع گجرات میں ۱۲۰۰ خلافت کمیٹیاں قائم ہو گئیں۔

ترکِ موالات کی تحریک نے حکومت کا ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ بچوں نے اسکول، نوجوانوں نے کالج، وکلا نے عدالتوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ ولایتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک زور پکڑ گئی۔ خلافت کمیٹیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ پورا ہندوستان سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گیا۔ اس دیوار میں دراڑیں ڈالنے کے لیے حکومتی ہتھکنڈوں نے قادیانیت کو ہتھیار بنایا۔ قادیانی مذہب کا سربراہ مرزا بشیرالدین محمود، اتحاد کو انتشار میں بدلنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو گیا۔ اس نے ایک طرف آریہ سماجی لیڈروں سے اسلام کے نام پر جھگڑا مول لیا تاکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے۔ دوسری طرف مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑانے کے لیے اعتقادی جھگڑوں کو ہوا دینی شروع کی۔

قادیانیوں کی اس حرکت کا جواب عطاءاللہ شاہ بخاری کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا تھا۔ وہ مذہب سے واقف بھی تھے اور مبلغ بھی۔ خطابت کی باریکیوں سے بھی واقف تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ مسلمانوں کو ان پر اعتماد بھی تھا۔ انہوں نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور اس فتنے کی سرکوبی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ مرزا بشیر کا تعاقب کرتے ہوئے وہ گجرات سے امرتسر پہنچ گئے۔

بندے ماترم ہال میں مرزا بشیر نے جلسے کا اعلان کیا ہوا تھا۔ شہر کے مسلمانوں کو اس جلسے میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ عطاءاللہ شاہ بھی عام مسلمان کی حیثیت سے اس اجتماع میں شامل ہو گئے۔ ان کا ارادہ تقریر کرنے کا نہیں تھا۔ وہ صرف سننے گئے تھے کہ مرزا کیا کہتا ہے۔ مرزا بشیرالدین ایک منصوبے کے تحت مسلمانوں کو ورغلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ایک حدیث سنائی لیکن حدیث کے الفاظ غلط پڑھے۔ وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ مجمع میں سے کون ان کی غلطی پکڑ سکے گا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کا تعاقب کرنے والا اس وقت بھی وہاں موجود ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اسے ٹوکا لیکن مرزا بشیر اپنی ضد پر اڑے رہے۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ عطا اللہ شاہ بخاری ان کے درمیان موجود ہیں تو انہوں نے بھی شاہ صاحب کا ساتھ دیا اور ہنگامہ آرائی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مرزائی جو انتظامات پر مامور تھے، انہوں نے پولیس کو طلب کر لیا۔ شاہ صاحب فوراً اسٹیج پر پہنچے اور اعلان کیا کہ جتنے مسلمان یہاں بیٹھے ہیں، ہال سے باہر چلے جائیں۔ تمام مسلمان ان کے حکم پر ہال سے باہر چلے گئے۔ شاہ جی ان سے پہلے باہر نکل چکے تھے۔ وہ شمشیرِ برہنہ کی طرح قادیانیت پر ٹوٹ پڑے۔ مرزا اور اس کے مذہب کے پرخچے اڑا دیے۔ مرزا بشیر کو ہال کے عقبی دروازے سے باہر نکلنا پڑا۔

شاہ جی کے اس قسم کے اقدامات نے مرزائیوں کے حوصلے پست کر دیے۔ اس ایک فرد نے فوج کے پورے دستے کا کام کیا۔ ہر گوشے سے شکست کھانے کے بعد مرزائیوں کو خاموش ہونا پڑا۔

شاہ جی کی شخصیت اب امرتسر اور گجرات سے نکل کر راوی اور چناب کی لہروں پر تیرنے لگی تھی۔ بیاس اور ستلج کی موجوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ دہلی سے اٹک تک وہی وہ تھے۔ اب ان کی آواز میں بغاوت کے ترانے گونج رہے تھے۔ اب خطروں سے کھیلتے کھیلتے وہ خود خطرہ بن گئے تھے۔

مخبروں نے اطلاع دی تھی کہ عطاءاللہ شاہ بخاری،

انگریزوں کا دشمن نمبروں ان دنوں امرتسر آیا ہوا ہے اور کوچۂ موہر کنداں میں ٹھہرا ہوا ہے۔ دن کے اجالے کو رات کے اندھیرے میں بدلنے کا انتظار کیا گیا۔ اس اندھیرے کو مزید گہرا ہونے کا وقت دیا گیا۔ جب آدھی رات گزر گئی' سڑکیں تک سو گئیں تو پولیس کی گاڑیاں کوچۂ موہر کنداں کی طرف روانہ ہوئیں۔ مخبر نے اشارہ کیا اور مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ چند سائے رینگتے ہوئے گھر کے دروازے تک گئے اور دروازے کو پیٹ ڈالا۔ دروازہ کھلا اور وہی سائے اندر گھسنے لگے۔

"کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟ یہ ایک مسلمان کا گھر ہے' تم اس طرح اندر نہیں جا سکتے" کہنے والے نے کہا۔

"ہم عطا اللہ شاہ بخاری کی تلاش میں آئے ہیں۔"

"میں ہی عطا اللہ شاہ بخاری ہوں' کہو' کیا کہنا ہے؟"

"ہمارے پاس تمہاری گرفتاری کے احکامات ہیں۔"

"میرا جرم؟"

"تم نے مسجد خیرالدین میں حکومت کے خلاف تقریر کی ہے۔"

"میں نے قرآن کریم پڑھا تھا۔"

"جو کہنا ہے عدالت میں کہنا۔ ہم تمہیں دفعہ ۲۴ الف کے تحت گرفتار کرتے ہیں۔"

"بھائی' دن کے اجالے میں آتے تو میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتا۔ چوروں کی طرح رات کے پچھلے پہر کیوں آئے ہو" عطا اللہ شاہ نے مسکراتے ہوئے ہتھکڑیوں کے لیے ہاتھ آگے کر دیے۔

یہ ۲۷ مارچ ۱۹۲۱ء کی رات تھی جب شیر کو قیدی بنا کر' پولیس کی گاڑیاں جیل کی طرف جا رہی تھیں۔ اہل امرتسر نیند کی آغوش میں تھے اور حکومت یہی چاہتی بھی تھی۔

یہ کوئی معمولی گرفتاری نہیں تھی۔ انہوں نے صرف تیس سال کی عمر میں اتنی مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ اس روز امرتسر میں کوئی دکان نہیں کھلی۔ کسی گھر میں چولھا گرم نہیں ہوا۔ جیسے جیسے دن چڑھتا گیا' لوگوں کا غم و غصہ بڑھتا گیا۔ لوگوں کی بھیڑ کوتوالی کے سامنے جمع ہو گئی۔ عوام کا مطالبہ تھا کہ یا تو عطا اللہ شاہ کو ان کے سامنے لایا جائے یا انہیں عطا اللہ شاہ بخاری کے پاس لے کر جایا جائے۔ وہ اس بات کی تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ ان کا سرفروش لیڈر' خطیب اعظم خیریت سے ہے؟ اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔ ہجوم اتنا بڑھ گیا' مطالبہ اتنا زور پکڑ گیا کہ پولیس کو مجبور ہونا پڑا۔ آخر طے پایا کہ ہجوم اپنے چند آدمی منتخب کرے چنانچہ پانچ ہندو' پانچ مسلمان حوالات میں ان سے ملنے گئے۔

شاہ جی جنگلے کے پیچھے اس طرح ٹہل رہے تھے جیسے شیر اپنی کچھار میں ٹہلتا ہے۔ زبان پر قرآن کریم کی آیات اس وقت بھی جاری تھیں۔ ملنے کے لیے آنے والوں پر نظر پڑی تو ایک دلکش تبسم ان کے چہرے پر پھیل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ شاہ صاحب کی خیریت دریافت کرتے' شاہ صاحب نے ان کی مزاج پرسی کی۔

"آپ فکر نہ کریں' آپ کی ضمانت کی کوششیں ہو رہی ہیں۔" وفد کے لوگوں نے کہا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" شاہ صاحب نے تڑپ کر کہا "آپ نے مجھے بزدل سمجھا ہے یا وطن کا غدار سمجھتے ہو۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو باہر نکل کر پھر وہی کروں گا جس کی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔"

جب مقدمہ چلایا گیا تو عدالت کے روبرو بھی انہوں نے اپنی صفائی میں صرف اتنا کہا۔

"میں ترک موالات کا حامی ہوں۔ قرآن میری صفائی ہے۔ قرآن میرا گواہ ہے۔ قرآن ہی میرا مذہب ہے اور قرآن ہی میرا دین۔ اس کے علاوہ میں کچھ اور کہنا نہیں چاہتا۔"

مقدمے کا فیصلہ ہوا تو عدالت نے انہیں تین سال قید بامشقت کی سزا سنائی جس میں تین ماہ کی قید تنہائی بھی شامل تھی۔

ڈسٹرکٹ جیل امرتسر میں ان کی موجودگی خطرناک ہو سکتی تھی لہٰذا صرف تین دن بعد انہیں لاہور جیل میں منتقل کرنے کے احکامات آ گئے۔ منتقلی کو خفیہ رکھا گیا تھا لیکن جب انہیں لوہے کی بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر اسٹیشن لایا گیا تو ہزاروں افراد جمع تھے۔ نعرے لگ رہے تھے۔

"حکومت برطانیہ مردہ باد! عطا اللہ شاہ بخاری زندہ باد!"

حکام بالا کو ان کا سینٹرل جیل لاہور میں رہنا بھی پسند نہ آیا اور انہیں میانوالی جیل منتقل کر دیا گیا۔ یہاں کی آب و ہوا اور موسم گرما کی تپش کی وجہ سے یہ جیل پنجاب کا "کالا پانی" کہلاتی تھی۔ انہیں یہاں بھیجنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ آزادی کے متوالے پر کچھ اور سختی کی جائے۔

عطا اللہ شاہ جیل میں تھے اور جیل سے باہر سازشوں کی آندھیاں زور شور سے چل رہی تھیں۔ ایسی ہی ایک سازش نے تحریک ترک موالات کا خاتمہ کر دیا۔

یوپی کے ضلع گورکھ پور کے دیہاتی عوام نے اپنے گاؤں

چوراچوری کے پولیس تھانے پر حملہ کرکے اسے آگ لگادی۔ اس واقعے میں سپاہی اور افسر جل کر راکھ ہوگئے۔ گاندھی جی نے اسے اپنی اہنسا پالیسی کے خلاف قدم سمجھا اور کسی سے مشورہ کیے بغیر تحریک ترکِ موالات بند کردی۔

تھانے کی آگ بجھی تو اس آگ سے حکومتِ برطانیہ کی خوشی کے لاکھوں چراغ جل اٹھے۔ ہندوستانیوں کے چہرے دھواں بن گئے۔ گاندھی جی کے خلاف جذبات کے شعلے بھڑک اٹھے لیکن سب کچھ جل کر راکھ ہوچکا تھا۔

سازشوں نے ایک قدم اور بڑھایا۔ ایک ہندو انتہا پسند سوامی شردھانند کو اس کی میعاد اسیری سے قبل رہا کرکے دہلی وائسرائے لاج میں رکھا گیا۔ کچھ ایسی سازباز ہوئی کہ جب وہ وائسرائے لاج سے نکلا تو ہندو مسلم فساد کا منشور اس کے ہاتھ میں تھا۔

تاریخ نے بھی ایک کھیل کھیلا۔ برطانیہ اور ترکی کے درمیان صلح ہوگئی۔ اب ہندوستان میں بننے اور چلنے والی تحریکِ خلافت کا کوئی جواز ہی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ مریض ہی نہیں رہا تھا جس کے علاج کے لیے خلافت کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں۔

عطاء اللہ شاہ بخاری کی رہائی کا پیام آیا مگر اس حالت میں کہ بہار کے آشیانے پر خزاں نے قبضہ جمایا ہوا تھا۔ جب وہ گرفتار ہوئے تھے تو ہندوستان کے عوام انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ کو ہوا دے رہے تھے اور جب رہا ہوئے تو وہی عوام آپس کی آگ میں جل رہے تھے۔ سازشوں نے ہندو مسلم اتحاد کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

شاہ صاحب نے بجھے دل سے جیل سے باہر قدم رکھا' مایوسی سے آسمان کی طرف دیکھا اور بے دلی سے امرتسر کی طرف رخ کیا۔ ایک عقیدت مند نے اپنے مکان کے دروازے ان پر کھول دیے۔ کوچۂ عارف ڈرا' چوک فرید کا یہ مکان اب ان کی رہائش گاہ تھا۔ مکان کی تنہائی میں بیٹھ کر اب انہیں یہ سوچنا تھا کہ بساطِ وقت پر آئندہ انہیں کون سا مہرا چلنا ہے۔

ہندو انتہا پسندوں کی تحریکات نے خلافت اور کانگریس کے تمام رہنماؤں کو وقت کی چادر میں لپیٹ کر گوشۂ عافیت میں چھپادیا تھا۔ پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ آگ لگی ہوئی تھی۔ زبانیں گنگ تھیں' ہاتھ سمٹ کر رہ گئے تھے۔ ایسے میں عطاء اللہ شاہ بخاری سر سے کفن باندھ کر نکل کھڑے ہوئے۔ ان کے پاس ان کی شعلہ بیانی کے سوا کیا تھا۔ وہ گلی گلی جلسے کرکے ہندو انتہا پسندوں کے خلاف محاذ گرم کرتے رہے۔ اسلام اور مسلمانوں کی وکالت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ اگر ایسی زہریلی تحریکات کے خلاف ان کی پُرجوش تقاریر بند نہ باندھتی تو اس سیلاب میں سب کچھ بہہ جاتا۔

عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں سے مسلمان دشمن تحریکات کا کچھ زور ٹوٹا تھا کہ قادیانیوں نے ان کی تمام محنت پر پانی پھیردیا۔ ان لوگوں نے آریہ سماجیوں کو ایسا موقع دے دیا کہ وہ مسلمانوں کے قریب آتے آتے پھر دور ہوگئے۔ یہ بھی دراصل برطانوی سازش کا ایک حصہ تھا۔ مرزائیوں نے بعض ایسی کتب شائع کیں جن میں آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کی زندگی پر رکیک حملے کیے جس کے جواب میں آریہ سماج نے قادیانیوں کے بجائے نبی کریمؐ کی ذاتِ اقدس کو ہدفِ تنقید بنایا۔ طرفین کی عبارتوں نے حالات کو بد سے بدتر بنادیا۔

قادیانیوں نے یہ کام مسلمان بن کر کیا تھا تاکہ جواب میں آریہ سماجیوں کا نزلہ مسلمانوں پر گرے۔ عطا اللہ شاہ بخاری نے اس سازش کو بھانپ لیا اور قادیانیوں سے مسلمانوں کی لاتعلقی کا اعلان کیا اور ہندوستان کے علما کو مرزائیوں کے خلاف فتویٰ جاری کرنے پر مجبور کردیا۔ ڈھائی سو علما نے اس فتوے پر دستخط کیے۔

"ان (مرزائیوں) سے ہر قسم کا قطع تعلق کیا جائے۔ خواہ دنیوی ہو یا دینی۔"

اس فتوے کے بعد بھی مرزائیوں نے ایسی کتب کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا جن میں ہندو دھرم' آریہ سماج اور ان کے مشہور لیڈروں کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا۔ جواب میں ہندوؤں کی جانب سے آنحضرتؐ کی ذات کو نشانہ بنایا جاتا۔ الزام مسلمانوں پر آتا کہ پہل انہوں نے کی تھی۔ مسلمانوں کا غم و غصہ روز بروز بڑھتا جارہا تھا کہ ایک کتاب "رنگیلا رسول (نعوذ باللہ) نے حالات کو بالکل ہی تباہی کے دہانے پر کھڑا کردیا۔ ہر مسلمان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ کتاب کے ناشر راج پال کو گرفتار کیا جائے۔ اس مطالبے پر اسے گرفتار کیا بھی گیا عدالت سے تین سال کی سزا بھی ہوئی لیکن ہائی کورٹ نے بری کردیا۔ بس پھر کیا تھا' جذبات کے زور نے ہر دیوار گرادی۔ ان پاک ہستیوں کو گالیاں دی جارہی تھیں جن کی ناموس کی حفاظت کے لیے گناہ گار سے گناہگار مسلمان بھی جان دینے کو تیار رہتا ہے۔ مسلمانانِ لاہور نے موچی دروازے کے باغ میں ایک جلسے کا اعلان کیا۔ حکومت نے خوف زدہ ہوکر دفعہ ۱۴۴ لگادی۔ یہ جلسہ

کسی حال میں نہیں ٹل سکتا تھا۔ شاہ جی کی تجویز پر جلسے کا مقام تبدیل کردیا گیا۔ قریب ہی ایک احاطہ تھا جو مرزا رحیم کا احاطہ کہلاتا تھا، شاہ جی نے مسلمانوں کو اس احاطے میں جمع ہونے کا حکم دیا۔

یہ مقام چار دیواری کے اندر تھا اس لیے یہاں دفعہ ۱۴۴ کا اطلاق نہیں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود ڈپٹی کمشنر، پولیس فورس کے ساتھ احاطے کے اندر داخل ہوگئے۔

"دفعہ ۱۴۴ کے باعث یہ مجمع خلاف قانون ہے۔ آپ لوگ پانچ منٹ کے اندر اندر یہاں سے چلے جائیں ورنہ مجھے گولی چلانے کا حکم دینا پڑے گا" ڈپٹی کمشنر نے اعلان کیا۔

اس جلسے کے ایک مقرر خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے ڈپٹی کمشنر کو ڈانٹا "ہم اس قانون کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہیں جو قانون ہمیں ناموسِ پیغمبرؐ کی حفاظت کی ضمانت نہیں دیتا۔ تم جو چاہو کرو، ہم یہ جلسہ ضرور کریں گے۔"

یہ تیور دیکھ کر ڈپٹی کمشنر نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہ یہاں سے کھسک لے۔ احاطے کے باہر فوج اور پولیس کی نفری موجود تھی۔ احاطے کے اندر جلسہ شروع ہوچکا تھا۔ عطاءاللہ شاہ بخاری کسی شیر کی طرح گرج رہے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا خطابت کے نشیب و فراز اسی دن کے لیے انہوں نے سیکھے تھے۔

"آج مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کے دروازے پر ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ آئیں اور فرمایا کہ ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کفار نے ہمیں گالیاں دی ہیں۔ ارے دیکھو تو! ام المومنین عائشہ صدیقہؓ دروازے پر تو کھڑی نہیں؟

شاہ جی کا یہ کہنا تھا کہ حاضرین میں کہرام مچ گیا۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ کمبل میں لپٹے ہوئے ایک نوجوان شخص نے ایک جھرجھری لی اور کمبل میں منہ چھپا کر رونے لگا۔

شاہ صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج سبز گنبد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تڑپ رہے ہیں اور خدیجہؓ و عائشہؓ پریشان ہیں۔ آج اُمّہات المومنین عائشہؓ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کررہی ہیں۔"

کمبل میں لپٹے ہوئے شخص نے اپنا چہرہ کمبل سے باہر نکالا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ آنسوؤں سے تر۔ اس نے بے اختیار ہوکر اٹھنا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر بیٹھ گیا۔ شاہ صاحب کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔

"آج ام المومنین عائشہؓ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کررہی ہیں۔ وہی جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حمیرا کہہ کر پکارتے تھے۔ جنہوں نے سیّد دوعالمؐ کو رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی" یہاں تک آتے آتے خود شاہ جی کے آنسو جاری ہوگئے۔ کچھ دیر بعد وہ پھر مخاطب ہوئے۔

"اگر تم خدیجہؓ اور عائشہؓ کی ناموس کی خاطر جانیں دے دو تو کچھ کم فخر کی بات نہیں۔ یاد رکھو، یہ موت آئے گی تو پیامِ حیات لے کر آئے گی۔"

اس تقریر نے دریائے جذبات کے کنارے توڑ دیے تھے۔ احاطے میں جگہ کم پڑ گئی تھی جو لوگ باہر جمع ہوگئے تھے پولیس ان پر لاٹھی چارج کررہی تھی۔ لوگ اتنے بپھرے ہوئے تھے کہ لاٹھیاں کھا رہے تھے لیکن اپنی جگہ سے ہلتے نہ تھے۔ شاہ جی عوام کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی اپیل کررہے تھے۔

"ہمارا مؤقف قتل و غارت گری نہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ بُرطانوی حکومت تعزیراتِ ہند میں ایک ایسی دفعہ کا اضافہ کرے جس کی رو سے بانیانِ مذاہب کے خلاف تقریر و تحریر کی پابندی ہو اور اس کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم کہلائے۔"

اس قرارداد کے بعد جلسہ برخاست کردیا گیا۔ عوام کو پُرامن طور پر باہر نکالنے کے لیے شاہ صاحب خود دروازے پر کھڑے ہوگئے۔ اچانک ڈپٹی کمشنر مسٹر اوگلوی سے ان کا آمنا سامنا ہوگیا۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اس سے کہا۔

"اوگلوی! اوکھے گھر نیوندرہ پایا ای (اوگلوی! تم نے مشکل گھرانے سے ٹکر لی ہے)۔

کمبل والا شخص سب سے آخر میں دروازے سے باہر آیا۔ عطاءاللہ شاہ بخاری سے ہاتھ ملایا اور تیزی سے ایک طرف کو چل دیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا جارہا تھا جیسے کسی کی تلاش میں ہو۔ پھر جیسے اسے مطلوبہ شخص مل گیا۔ اپنی دانست میں ایک پڑھے لکھے شخص کو اس نے مخاطب کیا۔

"یہ راج پال کڑی شے اے۔"

"اسی نے تو یہ کتاب چھاپی ہے جس کا ذکر شاہ جی کررہے تھے۔"

"یہ ملعون ہوتا کہاں ہے؟"

"اسپتال روڈ پر اس کا دفتر ہے مگر وہ خود آج کل جیل میں ہے۔"

"جیل میں ہے؟"

"ہاں، اسے تین سال کی سزا ہوگئی ہے لیکن وہ ہائی کورٹ میں اپیل کر رہا ہے۔ وہاں بھی مقدمہ چلے گا پھر دیکھو سزا ہوتی ہے یا باہر آتا ہے۔"

"پھر تو انتظار کرنا پڑے گا" کمبل والے شخص نے کہا اور کندھے جھٹکا کر ایک طرف کو چل دیا۔

شاہ جی کی تقریر اپنا کام کر چکی تھی۔ گستاخانِ رسولؐ کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ ایک دن خبر آئی کہ سوامی شردھانند کو ایک مسلمان نے قتل کر دیا۔

شاطرانِ فرنگ نے محکوم رعایا کو خوش کرنے کے لیے تعزیراتِ ہند میں ترمیم کرکے ہر ایسی تقریر و تحریر جرم قرار دے دی جس سے کسی مذہب کے بزرگ یا بانی کی اہانت کا پہلو نکلتا ہو لیکن بڑی ہوشیاری سے پہلے کی متنازعہ فیہ کتب کو ممنوع قرار نہ دیا۔ مسلمانوں کی بے چینی اسی طرح قائم رہی۔

اس بے چینی میں اس وقت اور اضافہ ہوگیا جب عطاء اللہ شاہ بخاری کو گرفتار کرلیا گیا اور پھر ایک سال کی سزا سنا کر رہتک جیل بھیج دیا گیا لیکن اس وقت تک وہ دہلی، امرتسر، لاہور اور لدھیانہ کے اضلاع میں مسلمانوں کو گستاخانِ رسولؐ کے انتقام پر آمادہ کر چکے تھے۔

○☆○

"علم دین، تم ان دنوں کچھ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہو، کہیں ٹک کر کام بھی نہیں کرتے۔ کیا بات ہے؟" اس کے دوست نے ایک دن اس سے پوچھا۔

"بس کچھ طبیعت بیراگی سے ہوگئی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں" علم دین نے جواب دیا۔

"کوئی تو وجہ ہوگی، کوئی عشق وشق کا چکر تو نہیں؟"

"چکر تو عشق کا ہے مگر تم سمجھوگے نہیں۔"

"سمجھنے میں کون سی دیر لگتی ہے، تم بتاؤ تو سہی۔"

"چھوڑو ان باتوں کو۔ تم اخبار پڑھ رہے تھے، کیا لکھا ہے اخبار میں؟"

"آج کل سکھوں اور ہندوؤں میں بڑا اتحاد ہو رہا ہے۔ دونوں مل گئے تو مسلمانوں کے لیے بڑا خطرہ ہو جائے گا۔"

"اپنے عطاء اللہ شاہ بخاری کی کچھ خیر خبر ہے؟"

"ایک سال کے لیے اندر گئے تھے۔ اب باہر آنے ہی والے ہیں۔ بس دو چار روز میں آجائیں گے۔"

"اچھا بھائی، میں چلتا ہوں۔"

وہ ان دنوں اِدھر اُدھر بیٹھ کر وقت گزار لیتا تھا۔ اخباروں سے اس کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ ایک دن اسے کسی نے بتایا، عطاء اللہ شاہ بخاری جیل سے رہا ہو کر امرتسر پہنچنے والے ہیں۔ ان کی آمد پر شہر کو دُلھن کی طرح سجایا جائے گا۔ علم دین نے کہیں سے کچھ پیسے جمع کیے اور امرتسر پہنچ گیا۔ امرتسر شہر واقعی دلھن کی طرح سجا ہوا تھا۔ رات بھر چراغاں ہوا تھا۔ دوسرے دن عطاء اللہ شاہ بخاری کا جلوس نکلنے والا تھا۔ علم دین کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی میلے میں آیا ہوا ہے۔

دوسرے دن ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ہجوم کے ساتھ وہ بھی ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹرین نے پلیٹ فارم کے قدم پکڑے۔ شاہ صاحب کے دوسرے ساتھی جنھیں ان کے ساتھ رہائی ملی تھی، گاڑی سے نیچے اترے لیکن جس کے لیے یہ میلہ سجا تھا، وہ نہ جانے کس مصلحت کے تحت غائب ہوگیا تھا۔ گویا بارات آئی، دولھا نہ آیا۔ آنکھوں نے بہت تلاش کیا لیکن لگتا تھا بینائی چلی گئی۔ عاشقوں کو صدمہ بھی تھا، غصہ بھی لیکن علم دین کو یہ فکر تھی کہ انہیں کچھ ہو نہ گیا ہو۔ وہ اسی وقت ٹرین میں بیٹھا اور لاہور آگیا۔ دوسرے دن کے اخبار سے اسے ان کی خیریت مل گئی اور وہ مطمئن ہوگیا۔

انہی دنوں راج پال بھی بری ہو کر جیل سے باہر آچکا تھا۔ یہ فرقہ پرست ہندوؤں کی جیت تھی۔ انہوں نے اور زور شور سے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ شاہ جی نے بھی تحفظِ عصمتِ انبیا کے لیے اپنی گدڑی سنبھالی اور بے سروسامانی کے عالم میں نکل کھڑے ہوئے۔

"مسلمانو! میں تمہاری غیرت کو جھنجوڑنے آیا ہوں۔ آج کفّار نے توہین پیغمبرؐ کا فیصلہ کرلیا ہے۔ انہیں شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسلمان مرچکا ہے۔ آؤ، اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔ گنبدِ خضرا کے مکین تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کی آبرو خطرے میں ہے۔ ان کی عزت پر کتے بھونک رہے ہیں۔ اگر قیامت کے دن محمدؐ کی شفاعت کے طالب ہو تو پھر نبیؐ کی توہین کرنے والی زبان نہ رہے یا سننے والے کان نہ رہیں۔"

علم دین ایک دکان پر بیٹھا تھا کہ اس نے اخبار میں راج پال کی تصویر دیکھی۔ اسی اخبار سے اسے یہ معلوم ہوا کہ اس نے اپنے دفتر میں بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔ اس نے وہ اخبار بغل میں دبایا اور گھر پہنچ گیا۔

"بھابی، کچھ کھانے کو ہوگا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"آج ابھی سے بھوک لگ گئی؟"

"کچھ ہے تو دے دو ورنہ میں چلا۔"

"تم گھر میں رہتے ہی کب ہو۔ بیٹھو، میں کھانا لاتی

ہوں۔"
علم دین نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ دو گلاس پانی کے پئے اور اپنی کوٹھری میں گھس گیا۔ ایک موٹی چادر میں خود کو لپیٹا اور باہر نکل آیا۔

"بھائی، تمہارے پاس آٹھ آنے، چار آنے ہوں گے؟"

"اب پیسے بھی دوں۔ خود تو کچھ کماتے دھماتے ہو نہیں۔"

"بس آٹھ آنے دے دو۔ اس کے بعد کبھی نہیں مانگوں گا۔"

"علم دین، تو کیسی باتیں کر رہا ہے، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"شام تک تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔"

بھائی نے پیسے دیے اور وہ باہر نکل گیا۔ بازار سے تیز دھار کا بڑا خنجر خریدا اور چادر میں چھپالیا۔ اب وہ اسپتال روڈ کی طرف جارہا تھا جہاں راج پال کا دفتر تھا۔

راج پال کی حفاظت کے لیے اس کے دفتر کے سامنے پولیس کا پہرا تھا۔ علم دین نے اپنے آپ کو چادر میں چھپایا اور دفتر کی طرف جانے والی سیڑھیوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ پولیس والوں نے یہی سمجھا ہوگا، کوئی فقیر ہے جو یہاں بیٹھا ہوا ہے۔

علم دین نے اخبار میں چھپی ہوئی تصویر کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ راجپال کو دیکھتے ہی پہچان لے گا۔ انتظار کے لمحے طویل ہوتے جارہے تھے۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی کہ اسے سیڑھیوں سے اترتا ہوا راجپال نظر آیا۔ اس کے ہاتھ مضبوطی سے خنجر کے دستے پر جمے ہوئے تھے۔ جیسے ہی راج پال نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا، وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور راج پال کے سامنے پہنچ گیا۔ جتنی دیر میں وہ سنبھلتا، علم دین نے اس پر حملہ کردیا۔ جتنی دیر میں حفاظت پر مامور پولیس والے پہنچتے، اس کا خنجر راج پال کا کام تمام کرچکا تھا۔ علم دین نے بھاگنے کی کوشش تک نہیں کی۔ پولیس والوں نے اسے دبوچ لیا۔

راجپال کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اس کے ساتھ ہی مسلمان رہنماؤں کی طرف سے علم دین کو بچانے کے لیے کوششیں شروع ہوگئیں۔

اس موقع پر خلیفۂ قادیاں مرزا بشیرالدین محمود نے ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جمعہ کو خطبے میں علم دین سے متعلق یہ خطبہ دیا۔

"وہ خبیث الفطرت لوگ جو انبیاؑ کو گالیاں دیتے ہیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ اسی طرح اس قوم کا، جس کے جوشیلے نوجوان قتل کرتے ہیں خواہ انبیاؑ کی توہین ہی کی وجہ سے وہ ایسا کریں، فرض ہے کہ پورے زور کے ساتھ ایسے لوگوں کو دبایا جائے اور ان سے اظہار برأت کرے۔ وہ نبی بھی کیسا نبی ہے جس کی عزت بچانے کے لیے خون سے ہاتھ رنگنا پڑیں۔ جس کو بچانے کے لیے اپنا دین تباہ کرنا پڑے۔ یہ سمجھنا کہ محمدؐ کی عزت کے لیے قتل کرنا جائز ہے، سخت نادانی ہے۔ وہ لوگ جو قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں وہ بھی مجرم ہیں اور اپنی قوم کے دشمن ہیں اور جو ان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے وہ بھی قوم کا دشمن ہے۔"

اپریل کا مہینہ گزر گیا۔ مئی کے شروع میں علم دین کا مقدمہ زیر دفعہ ۳۰۲ عدالت میں پیش ہوا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس مقدمے میں علم دین کی پیروی کی ذمے داری قبول کی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ علم دین اس قتل سے انکار کردے۔ صرف یہی صورت اس کے بچنے کی ہے لیکن وہ ہرگز اس پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ جب ملزم خود ہی اقبال کرلے تو پھر وکیل بھی کیا کرسکتا ہے چنانچہ علم دین نے جب عدالت کے روبرو یہ کہا۔

"میں اس عدالت میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ میں نے رنگیلا رسول کے ناشر راج پال کو قتل کیا ہے۔ اس لیے کہ کتابِ مذکور سے میرے نبیؐ کی سخت توہین ہوئی تھی۔ راج پال کو اپنے اس فعل پر نہ ندامت تھی اور نہ افسوس۔ اگر میں اس مقدمے میں بری کردیا گیا تو میں توہینِ رسولؐ کرنے والے کو پھر قتل کروں گا۔"

اس اقبالِ جرم کے بعد ۲۲ مئی ۱۹۲۹ء کو سیشن جج کی عدالت سے اسے سزائے موت کا حکم ہوا۔ ۱۵ جولائی کو ہائی کورٹ نے بھی اپیل خارج کردی۔ پھر پریوی کونسل نے بھی فیصلہ بحال رکھا۔ آخر ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو میاں والی جیل میں اسے پھانسی پر لٹکادیا گیا۔

مسلمانوں کے مطالبے پر ۱۷ نومبر کو لاش لاہور لائی گئی اور لاکھوں مسلمانوں نے اس شہید کو قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک کردیا۔

ع صلۂ شہید کیا ہے، تب و تابِ جاودانہ ہے

علم دین کی شہادت نے گویا حوصلوں کے دروازے کھول دیے۔ ہندوستان کے تقریباً ہر شہر میں گستاخانِ رسولؐ کے قتل کی وارداتیں زور پکڑ گئیں۔ نوجوان عصمتِ رسولؐ

کی حفاظت کرتے رہے اور پھانسی کے پھندوں کو چومتے رہے۔ یہاں تک کہ گستاخ زبانیں ہمیشہ کے لیے خاموش کرادی گئیں۔

❁✲❁

مسلمان رہنماؤں نے گاندھی اور کانگریس سے مایوس ہوکر اپنی علیحدہ تنظیم کا فیصلہ کیا چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز پر نیشنلسٹ مسلمانوں نے آل انڈیا کانگریس کے پنڈال میں چودھری فضلِ حق کی صدارت میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا۔ اس اجلاس میں مجلسِ احرار کی بنیاد رکھی گئی اور عطاءاللہ شاہ بخاری کو پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

ان کے لیے ویسے ہی بکھیڑے کیا کم تھے کہ اس عہدے نے ان کی ذمے داریوں میں مزید اضافہ کردیا۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ جماعت نے جنگِ آزادی میں کانگریس کے دوش بدوش لڑنے کا فیصلہ کرکے شاہ جی کو مزید الجھادیا۔ انہیں مذہب اور سیاست، دونوں محاذوں پر بہ یک وقت لڑنا تھا۔

سیاسی اور مذہبی ابتری نے ملک کے امن وسکون تہ وبالا کیا ہوا تھا۔ شدھی تحریک، شاردا ایکٹ، شاتمِ رسولؐ کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے کمزور اور قلیل تعداد مسلمانوں کو اس قدر ہراساں کردیا تھا کہ علمائے کرام کو اپنی ذمے داریاں بھی مخدوش نظر آنے لگی تھیں۔

اس صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے لاہور میں انجمن خدام الدین کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری نے فرمائی۔ جس وقت شاہ جی جلسہ گاہ میں پہنچے، حضرت انور شاہ تقریر فرمارہے تھے۔ شاہ جی کو دیکھتے ہی انہوں نے اپنی تقریر کا رخ موڑدیا۔

"دین کی قدریں بگڑرہی ہیں۔ کفر چاروں طرف سے یلغار کرچکا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنے لیے ایک امیر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس کے لیے میں سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری کو منتخب کرتا ہوں۔ شاہ جی نے کمالِ عقیدت سے اپنے دونوں ہاتھ انور شاہ صاحب کے ہاتھوں میں دے دیے۔

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ حضرت نے میرے ہاتھ پر بیعت کی بلکہ حضرت نے مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمالیا ہے۔"

اس کے بعد باقی علما جن کی تعداد پانچ سو تھی عطاءاللہ شاہ بخاری کے ہاتھ پر بیعت کی اور انہیں امیرِ شریعت کے لقب سے نوازا۔ یہ اعزاز ان کی خدمات کا صلہ بھی تھا اور مستقبل کی امید کا آئینہ دار بھی۔

انہوں نے امیرِ شریعت کے لقب سے سرفراز ہوتے ہی پنجاب میں سول نافرمانی کا آغاز کردیا۔ بطور امیر اب ان کی یہ بھی ذمے داری تھی کہ وہ باقی مسلم جماعتوں خاص طور پر جمعیت علمائے ہند کو آمادہ کریں جو نہرو رپورٹ میں اختلاف کے باعث کانگریس سے الگ ہوچکی تھی چنانچہ وہ امروہہ پہنچ گئے جہاں جمعیت علمائے ہند کا جلسہ ہونے والا تھا۔ جلسے سے پہلے ہی مخالفین نے پروپیگنڈا کردیا تھا کہ یہ ہندوؤں کے زر خرید ہیں، وہابی ہیں، نجدی ہیں، پیروں کے دشمن ہیں مزید برآں انگریزوں سے لڑکر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ فضا دیکھ کر جمعیت کے رضا کاروں نے جمعیت کے جلوس کا ارادہ ملتوی کردیا لیکن اس بہادر رضا کار کو کوئی نہیں روک سکتا تھا جس کا نام عطاءاللہ شاہ بخاری تھا۔ انہوں نے حکم دیا۔

"آج ہم مفتی ہیں۔ جلوس نکالے جانے پر ہمارا فتویٰ چلے گا لہٰذا امروہہ کے بازاروں میں جلوس نکلے گا اور اس کی رہنمائی ہم خود کریں گے۔"

جلوس نکلا اور ہراول دستے میں امیر شریعت کا اونٹ سب سے آگے تھا۔ اسی رات ان کی تقریر کا بھی اعلان کیا گیا جس میں مخالفین نے اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کیا لیکن ان کی تقریر بعد نماز عشا شروع ہوکر رات تین بجے تک جاری رہی۔ کسی کو لب کشائی کی ہمت نہ ہوئی۔

"علمائے کرام! خلافت تحریک کے بعد ایک اور وقت آیا ہے کہ ہم عالمِ اسلام کے دشمن فرنگی سے جس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا مگر اسلام کے غروب ہونے کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔ ایسی جنگ لڑیں کہ وہ ہندوستان کو چھوڑنے پر مجبور ہوجائیں۔"

"اگر میں چھوٹے دشمن (ہندو) کے ساتھ مل کر انگریز ایسے اسلام کے بڑے دشمن کو شکست دے سکوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ سودا مہنگا نہیں ہوگا۔"

ان کی تقریر کے نکات نے ایسا اثر دکھایا کہ جمعیت علمائے ہند ان کی رائے سے متفق ہوگئی لیکن ان کی تقریر قانون کی نظروں میں باغیانہ ٹھہری۔ پنجاب پولیس بھی ان کی گرفتاری کے لیے امروہہ پہنچ گئی۔ ان کی گرفتاری کا خدشہ بڑھا تو کارکنوں نے ان کی تقریر کا اعلان کردیا۔

پولیس کے ہاتھ اچھا موقع آگیا۔ یہ سوچ کر ان کی گرفتاری سے عوام میں ہنگامہ نہ ہو، یہ طے کیا گیا کہ رات جب جلسے سے فارغ ہونے کے بعد قیام گاہ پر آئیں گے، گرفتار کرلیں گے۔

جلسے کی ابتدائی تقریر مولانا احمد سعید دہلوی کی تھی لیکن

لوگ امیرِ شریعت کی تقریر کے منتظر تھے۔ پولیس اپنی جگہ مطمئن تھی۔ رات نے دو بجائے تو مولانا نے اپنی تقریر روک دی۔

"اوہو! کافی رات جا چکی۔ آپ لوگ سیّد عطاءاللہ شاہ کی تقریر کے انتظار میں ہوں گے۔ چلو، پھر سن لینا۔ اب میں جلسہ برخاست کرتا ہوں۔"

اس اعلان سے پولیس میں بھگدڑ مچ گئی۔ قیام گاہ کا کونا کونا چھان مارا۔ معلوم ہوا یہ جلسہ تو پولیس کے لیے فریب تھا۔ عطاءاللہ تو جلسہ شروع ہوتے ہی امروہہ سے نکل گئے تھے۔ دوسرے دن اطلاع ملی کہ وہ الہ آباد پہنچ کر نہرو کے مہمان بن چکے ہیں۔ پولیس نے تعاقب کیا معلوم ہوا وہ آگرہ پہنچ گئے۔

ان کے خلاف اب تک بیس وارنٹ جاری ہو چکے تھے لیکن وہ ہر جگہ سے پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل جاتے تھے۔ مومن کی تو شان ہی یہ ہے کہ اِدھر ڈوبا، اُدھر نکلا۔

پولیس شکاری کتّوں کی طرح ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ اس اطلاع نے تھوڑی دیر کے لیے تاجِ برطانیہ کے جواہر ریزوں کی چمک چھین لی کہ وہ نہ صرف بمبئی پہنچ چکے ہیں بلکہ بندر روڈ پر ایک جلسے میں تقریر بھی کر رہے ہیں۔

لاکھوں کی آبادی کا شہر بندر روڈ پر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تاجِ برطانیہ کے محافظ دستے جلسے کی صفِ اول میں جگہ سنبھال چکے تھے اور ظاہر ہے وہ صرف تقریر سننے نہیں آئے تھے۔

امیرِ شریعت عطاءاللہ شاہ بخاری کی آمد کا اعلان ہوا۔ انہوں نے خطبۂ مسنونہ کے بعد تقریر شروع کی۔ کیا اچھا موقع تھا، وفادارانِ برطانیہ اگلی صفوں میں بیٹھے تھے۔ شاہ جی نے اپنی آنکھیں ان کی آنکھوں میں ڈال کر بات شروع کی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"غلامی سب سے بڑا گناہ ہے۔ اگر اس گناہ سے نکلنا ہے تو اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ ہم انگریزوں کے خلاف پُرامن لڑائی میں شریک ہو جائیں۔"

یہ فقرہ ابھی نامکمل تھا کہ مجمع سے کسی نے تیز دھار چھری ان کی طرف زور سے پھینکی۔ ایک نوجوان غالباً اس حرکت کو دیکھ رہا تھا، وہ جلدی سے آگے بڑھا اور چھری کو اپنے سینے پر روک لیا۔ ضرب اس قدر شدید تھی کہ تھوڑی دیر بعد زخمی نوجوان کا انتقال ہو گیا۔

اس نوجوان نے ان کی جان بھی بچالی اور افراتفری کا فائدہ اٹھا کر وہ پولیس کی گرفتاری سے بچ نکلنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ پولیس کا یہ حربہ بھی ناکام ہوا۔

پولیس انہیں کاروں اور ٹرینوں میں ڈھونڈتی رہی اور وہ پیدل چلتے ہوئے بمبئی سے نکل گئے۔ ایک ماہ تک سنگلاخ راستوں پر چلتے ہوئے وہ کلکتہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ کلکتہ کے عوام پہلے ہی انگریزوں کے خلاف دہشت پسندی اختیار کر چکے تھے۔ کانگریس کی تحریک سے بھی تعاون کر رہے تھے۔ اپنے درمیان عطاءاللہ شاہ بخاری کو دیکھا تو استقبال کے لیے راستے سج گئے۔ دیہات، قصبے اور شہر ان کی باغیانہ تقریروں سے گونجنے لگے۔ آخر ۳۰ اگست ۱۹۳۰ء کو دیناج پور میں دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ اکتوبر تک مقدمہ چلتا رہا اور پھر چھ ماہ کی قیدِ بامشقت کی سزا سنا کر انہیں علی پور جیل سے ڈم ڈم جیل بھیج دیا گیا۔

ابھی صرف تین مہینے کی جیل کاٹی تھی کہ تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے، ان میں وہ بھی تھے۔ رہائی کے بعد احرار کے دفاتر قائم کرنے کے لیے وہ پنجاب کے دورے پر روانہ ہو گئے۔

مئی ۱۹۳۳ء میں انہیں مدرسہ عربیہ کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے شجاع آباد جانا پڑا۔ خان محمد انور خاں کی حویلی میں قاضی احسان احمد کی زیرِ صدارت وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو قاضی صاحب سے پان کی فرمائش کی۔

"پان نہیں کھلاؤ گے؟"

"حاجی نور محمد!" قاضی صاحب نے قریب کھڑے ہوئے ایک احرار سے کہا "شاہ صاحب کے لیے پان تو لاؤ۔"

وہ تعمیلِ حکم کے لیے چلا ہی تھا کہ قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے پان پیش کر دیا "میں شاہ صاحب کے لیے پان لے آیا ہوں" یہ کہہ کر انہوں نے پان پیش کر دیا۔

عطاءاللہ شاہ بخاری نے تقریر کے دوران میں پان منہ میں رکھا اور تقریر شروع کر دی۔ ابھی پان پوری طرح چبایا بھی نہیں تھا کہ انہیں گڑبڑ کا اندیشہ ہوا، گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

"قاضی جی! زہر دے دیا" ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

قاضی صاحب نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ شاہ صاحب نے پان ان کے ہاتھ پر تھوک دیا۔ زہر اتنا سریع الاثر تھا کہ آن کی آن میں ان کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ قاضی صاحب کا ہاتھ بھی پھول کر ڈبل روٹی کی طرح ابھر آیا۔ جلسہ درہم برہم ہو گیا۔

زہر تقریباً اپنا کام دکھا چکا تھا۔ شاہ جی نڈھال تھے مگر ہوش میں تھے۔ ڈاکٹر نے مسلسل پیاز کا عرق پلانا شروع کیا۔ رات کو تین بجے ڈاکٹروں نے یہ نوید سنائی کہ اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔

قاتل گرفتار ہو چکا تھا۔ اسے شاہ جی کے سامنے لایا گیا۔ وہ اس کی طرف غور سے دیکھتے رہے۔ پھر ایک دل آویز تبسم ان کے ہونٹوں پر پھیل گیا۔ ان کے لبوں کو جنبش ہوئی۔

"بھائی، میں نے آپ کا کیا نقصان کیا تھا جو آپ نے یہ حرکت کی؟"

"شاہ صاحب، مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے معاف کردیں۔"

"میں نے تمہیں معاف کیا" پھر پولیس افسر سے مخاطب ہوئے "میں اس سے کوئی انتقام لینا نہیں چاہتا۔ خدا تعالیٰ اسے معاف فرمائے۔ آپ بھی اسے معاف فرمادیں۔"

یہ ان پر تیسرا قاتلانہ حملہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ جسے بچانا چاہے اسے کوئی نہیں مار سکتا۔

انہوں نے بہت چاہا کہ یہ اطلاع شجاع آباد سے باہر نہ جانے پائے لیکن وہ کوئی گمنام آدمی نہیں تھے کہ بات چھپی رہتی۔ اسی دن سفر کرتی ہوئی امرتسر پہنچ گئی۔ ان کی اہلیہ محترمہ اپنی چھوٹی بیٹی سے ہنس بول رہی تھیں کہ اس اطلاع نے انہیں سر سے پاؤں تک ہلا دیا۔ وہ بھی سمجھی ہوں گی کہ ان سے اصل بات چھپائی جارہی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے دل تھام کر بیٹھ گئیں۔ ایکا ایکی خون کی قے ہوئی۔ ڈاکٹروں نے ٹی بی کی نشان دہی کردی۔ نہ جانے کب سے وہ اس مرض کو دبائے بیٹھی تھیں کہ اچانک صدمے نے زخموں کے ٹانکے کھول دیے۔ ڈاکٹروں کی تجویز تھی کہ مریضہ کو کسی پہاڑی مقام پر رکھا جائے۔

وہ گھر پہنچے تو بیوی کپڑے کی طرح سفید ہو رہی تھیں۔ شوہر کو زندہ دیکھ کر چہرے پر اطمینان کی سرخی ابھری لیکن ان کی پریشانیوں کے بارے میں سوچ کر یہ سرخی پھر ماند پڑ گئی۔

"آپ قوم کی خاطر کتنی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں مگر کیا حاصل۔ آپ تو صحرا میں اذان دے رہے ہیں۔ کوئی سننے والا نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر ہمیں تو اپنا کام کرتے رہنا ہے۔"

"اپنی صحت دیکھی ہے۔ کتنی مدت بعد آپ کی شکل دیکھ رہی ہوں۔ کتنے نحیف ہوگئے ہیں آپ؟"

"واہ بیگم! ہم تو آپ کی مزاج پرسی کے لیے شجاع آباد سے امرتسر آئے ہیں اور آپ ہیں کہ الٹی ہماری خیریت پوچھنے بیٹھ گئیں۔"

"ڈاکٹروں نے ٹی بی بتائی ہے۔ کہتے ہیں کسی پہاڑی مقام پر کچھ دن رہا جائے تو صحت پر اچھا اثر پڑے گا لیکن ہماری اتنی بساط کہاں؟"

"اللہ مالک ہے، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

کہنے کو تو انہوں نے کہہ دیا تھا لیکن اتنی استطاعت کہاں تھی کہ کسی پہاڑی مقام کے اخراجات اٹھا سکتے۔ انہوں نے گھر کے سامان پر ایک نظر ڈالی۔ دو چارپائیوں اور چار برتنوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا جسے بیچا جاسکتا۔ انہوں نے شاید پہلی مرتبہ اپنے گھر کا جائزہ لیا تھا۔ جس کے ایک اشارے پر لاکھوں گردنیں کٹنے کو تیار تھیں، اسے دنیاوی دولت میں کس قدر قلیل حصہ ملا تھا۔

وہ ابھی اخراجات کی تکمیل کے لیے عقل کے کشکول میں پڑے سکّے شمار کر رہے تھے کہ مجلسِ احرار نے قادیان میں تبلیغی کانفرنس کرنے کا اعلان کر دیا۔

قادیان مرزا غلام احمد کی نبوّت کا مرکزی مقام تھا۔ مرزائی امّت بہت بڑی تعداد میں یہاں آباد تھی۔ عملاً اس قصبے میں مرزا بشیرالدین کی حکومت تھی۔ غیر مرزائی اپنی معاشی زندگی میں آزاد نہ تھے۔ قادیان کے غیر مرزائی عوام کی زبردست خواہش تھی کہ کوئی ان کے زخموں کا مرہم بن کر یہاں آئے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ قادیانیوں کے گڑھ میں جا کر انہیں للکارے۔ یہ چیلنج مجلسِ احرار نے قبول کیا۔ بیمار بیوی کو چھوڑ کر عطاءاللہ شاہ کو قادیان جانا پڑا۔

پنجاب کے مختلف شہروں سے احرار رضاکاروں کے قادیان پہنچنے کے لیے ریلوے حکام نے اسپیشل گاڑیاں چلانے کا انتظام کیا۔ جب یہ گاڑیاں قادیان کے لیے روانہ ہوئیں تو یہ نظارہ دیدنی تھا۔ گاڑیوں پر لگے سرخ جھنڈے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ نعروں کے شور سے بستیاں گونج رہی تھیں۔ یہ گاڑیاں پہلے امرتسر پہنچیں جہاں سے عطاءاللہ شاہ بخاری کو سوار ہونا تھا۔

جب یہ قافلہ قادیان ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو نصرت نے قدم چومے۔ آسمان نے تہنیت پیش کی، زمین نے مبارک باد دی۔ قادیان کی میونسپل حدود سے باہر غیر مسلموں سے کانفرنس کے لیے پہلے ہی جگہ حاصل کرلی گئی تھی۔ شہر میں ایک نیا شہر آباد تھا۔ خیمے نصب تھے۔ ان پر لگے ہوئے سرخ جھنڈے ہوا سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

لاکھوں انسانوں کی موجودگی میں نمازِ عشا کے بعد احرار تبلیغ کانفرنس کا پہلا اجلاس شاہ صاحب کی صدارت میں

شروع ہوا۔ وہ گویا ہوئے تو ستاروں نے رات بھر جاگنے کی قسم کھائی۔ کفر کی آنکھوں میں خوف نے جگہ بنالی۔ صبح کی اذان گونجی۔ ستاروں نے آنکھیں موندیں۔ امیر شریعت نے تقریر ختم کی۔

یہ تبلیغی کانفرنس تین دن چلنے کے بعد ختم ہوگئی۔ یہ قافلۂ کفر کے سینے پر اسلام کے جھنڈے گاڑ کر واپس ہوا تو عطاءاللہ شاہ بخاری کو پھر اپنی حرمِ محترم کا خیال آگیا۔ انہیں کسی پہاڑی مقام پر لے جانا تھا' تاکہ ان کا علاج ہوسکے۔ امرتسر پہنچتے ہی تیاری شروع کردی اور کہیں نہ کہیں سے انتظام کرکے بیوی بچوں کو مسوری لے گئے۔

وہ مسوری میں تھے مگر ان کی تقریر کی گونج ابھی تک قادیان میں گونج رہی تھی۔ حکومتِ برطانیہ کو یہ قطعی منظور نہیں تھا کہ ان کے لگائے ہوئے پودے کی کوئی جڑیں کاٹیں۔ یہ جسارت امیر شریعت نے کی تھی لہٰذا انہیں مسوری سے گرفتار کرلیا گیا۔ یہ بڑا مشکل وقت تھا۔ وہ بیمار بیوی کی تیمارداری میں مصروف تھے کہ پیغامِ گرفتاری آگیا لیکن دوسرے ہی دن ان کے ایک دوست نے انہیں ضمانت پر رہا کرالیا۔ وہ عام طور پر ضمانت کے قائل نہیں تھے لیکن بیوی کی بیماری نے انہیں مجبور کردیا۔ وہ پھر مسوری میں تھے۔

عدالت نے ان پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے لکھا۔

"ملزم نے اپنی تقریر کے دوران میں ملکِ معظم کی رعایا کے دو طبقات احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان دشمنی یا حقارت پیدا کرنے کی کوشش کی۔"

انہوں نے اپنی صفائی میں ایک طویل تقریر کی اور اس فردِ جرم کو جھٹلایا لیکن فضول۔ عدالت نے فردِ جرم کو برقرار رکھا اور فیصلے میں چھ ماہ قید بامشقت کی سزا سنادی۔

مقدمے کا فیصلہ تو ہوگیا۔ سزا بھی ہوگئی لیکن جس مقصد کے لیے تبلیغ کی گئی تھی اس مقصد کے حصول کی کوششوں کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ وہ جیسے ہی رہا ہوکر آئے۔ قادیان میں نمازِ جمعہ پڑھانے کا اعلان کردیا۔ ایک مرتبہ پھر مسلمانوں سے بھری ہوئی ٹرینیں گورداسپور کی طرف چل پڑیں۔ ہوا کا رخ بدلا ہوا دیکھا تو مرزائیوں نے شور مچایا کہ احرار کے سیلاب کو روکا جائے۔ حکومت نے پھر اپنے پودے کی حفاظت کی۔ قادیان میں' شاہ صاحب کے داخلے پر پابندی لگادی گئی۔

اسٹیشن پر اترتے ہی نوٹس کی تعمیل کرائی گئی لیکن شاہ صاحب نے اس پابندی کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ انکار کی پاداش میں انہیں گرفتار کرکے تین ماہ کے لیے جیل بھیج دیا۔

نماز جمعہ نہ ہوسکی لیکن نماز جمعہ کی تحریک نے ایک مستقل شکل اختیار کرلی۔ ہر جمعہ کوئی نہ کوئی گرفتاری ہوتی۔ آخر ایک ماہ بعد حکومت نے دفعہ ۱۴۴ واپس لے لی۔

عطاءاللہ شاہ بخاری جیل سے رہا ہوکر آئے تو سیاسی فضا کچھ سے کچھ ہوچکی تھی۔ صرف تین ماہ میں اتنا بڑا انقلاب آیا تھا کہ ان کی پریشانی کے لیے بہت تھا۔ مجلس احرار سمیت تمام سیاسی جماعتیں انتخابی ہنگاموں میں مصروف تھیں۔

شاہ جی ان ہنگاموں کو مخدوش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ انتخابات صوبوں کی خودمختاری کے لیے تھے جبکہ شاہ صاحب اسے انگریز کی ایک چال قرار دے رہے تھے۔ مجلس احرار انتخاب میں شرکت کا ارادہ کرچکی تھی اس لیے انہیں مجبور ہونا پڑا۔ انہیں اپنا اصل کام چھوڑ کر انتخابی مہم کے لیے وقت نکالنا پڑا۔

انتخابی ڈھونگ رچایا ہی اس لیے گیا تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ کی طرف سے توجہ ہٹاکر لوگ اپنے اقتدار کے حصول میں مشغول ہوجائیں۔ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے مقابل آکھڑی ہوں۔ انتخابی مہم میں ایک دوسرے پر حملے کیے جائیں۔ یہ سب آپس میں دست وگریباں ہوجائیں۔ امیرِ شریعت کو ان سب اذیتوں سے گزرنا پڑا۔

امیر شریعت ایک جلسے میں تقریر کررہے تھے کہ مولانا حسرت موہانی مخالف سمت سے خاصی جماعت کے ساتھ ان کی مخالفت کے لیے جلسہ گاہ میں آن پہنچے۔ عوام نے ان کی اس حرکت کو ناپسند کیا۔ قریب تھا کہ مجمع مولانا حسرت موہانی پر ٹوٹ پڑتا' شاہ صاحب نے مداخلت کی اور حسرت موہانی کو اسٹیج پر بٹھالیا۔

بجنور سے الہ آباد جاتے ہوئے اسٹیشن پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے امیر شریعت کی ملاقات ہوئی۔ عقیدت' محبت اور احترام کے ملے جلے جذبات سے امیر شریعت نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ اور معانقہ کرنا چاہا لیکن حضرت مدنی نے جو ان دنوں مسلم لیگ کی حمایت کررہے تھے' ان سے مصافحہ کرنے سے انکار کردیا۔

انتخابات ختم ہوئے تو مسلم لیگ کا راستہ الگ تھا' جمعیت علمائے ہند کی راہ الگ اور کانگریس الگ کھڑی تھی۔ ہاتھاپائی کا دامن سمٹ کر ان لوگوں کے آنگن میں لہرانے لگا جنہوں نے مستقبل میں صوبوں میں راج سنگھاسن سنبھالنے تھے۔

۱۹۴۳ء کا سورج ایک ایسا قانون لے کر طلوع ہوا جس

سے فرنگی سامراج کی جگہ اپنے دیس کے لوگوں نے آگے بڑھ کر غیر ملکی آئین کو اپنی رائے کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ نہایت ہوشیاری سے ایسے لوگ تیار کر لیے گئے جو اپنے اقتدار کے لیے انگریزوں سے وفاداری نبھانے پر مجبور تھے۔ یہ وقت شاہ جی پر بہت کڑا تھا لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ ذرا گرد بیٹھی تو وہ پھر انگریزوں کی خبر گیری کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

یورپ کے اُفق پر دوسری جنگِ عظیم کے بادل منڈلا رہے تھے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اگر اب برطانیہ' جنگ میں الجھا تو وہ سورج جو اس کی سلطنت میں غروب نہیں ہوتا' وہ اس کو لے ڈوبے گا۔ وقت کا تقاضا تھا کہ اس وقت برطانیہ پر ضرب کاری لگائی جائے۔ پنجاب کے ایسے علاقوں میں جا کر لوگوں کو انگریزی فوج میں بھرتی ہونے سے منع کیا جائے جو خالص فوجی علاقے کہلاتے ہیں چنانچہ عطاءاللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ضلع میانوالی کے دورے پر روانہ ہو گئے۔

یہ زمانہ پنجاب میں سرسکندر حیات کی وزارت کا زمانہ تھا۔ یونینسٹ پارٹی "سروں" اور "خان بہادروں" پر مشتمل تھی۔ حکومت کو یہ کبھی گوارا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی جادو بیانی سے پتھروں سے چشمے جاری کریں' مٹی میں آگ لگا دیں۔ ذہنوں کو بیدار کریں۔ دلوں کو انگریز مخالفت پر تیار کریں۔ حکومت کی پوری مشینری حرکت میں آگئی۔ خفیہ رپورٹیں تیار ہونے لگیں۔ ڈرایا دھمکایا جانے لگا۔ اردگرد کے جس علاقے میں وہ تقریر کرنے جاتے' آس پاس کا تمام علاقہ نامعلوم گولیوں سے گونجنے لگتا تاکہ وہ واپس چلے جائیں لیکن وہ پہاڑ کی طرح ڈٹے رہتے' طوفان کی طرح چلتے رہے۔

پندرہ دن کے کامیاب دورے کے بعد وہ واپس آئے تو سی آئی ڈی کے لوگ ان کی تقریروں کے نوٹس حکومت کو فراہم کر چکے تھے۔ حکومت کو ان کی یہ تقریریں پسند نہ آئیں۔ اس کی پاداش میں انہیں ضلع مظفر گڑھ سے گرفتار کر لیا گیا۔

اس مقدمے کی ایک خاص خوبی' جرح کے بعد یہ سامنے آئی کہ ایک چال کے تحت جعلی تقریر پیش کر کے مقدمہ بنایا گیا تھا لہٰذا کورٹ کو انہیں باعزت بری کرنا پڑا۔

ہائی کورٹ کا فیصلہ سنتے ہی ہجوم نے امیرِ شریعت کے نعرے بلند کیے۔ ابھی نعروں کی آواز مدھم نہیں پڑی تھی کہ ایک دوسرے مقدمے میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

اس مقدمے کا بھی وہی حشر ہوا۔ شاہ صاحب نے ثابت کر دیا کہ ان کی تقریر میں جملوں کو گھٹا بڑھا کر مطلب کچھ سے کچھ بنا دیا گیا ہے۔ جرح کا ایک تھکا دینے والا عمل شروع ہوا اور نتیجے میں یہ ہوا کہ وہ اس مقدمے سے بھی بری ہو گئے لیکن انہیں نو ماہ برابر جیل میں رہنا پڑا کیونکہ ان کی گرفتاری ناقابلِ ضمانت تھی۔

ان کی رہائی قانونِ برطانیہ کی شکست فاش تھی۔ مخالفین کو جس قدر سبکی ہوئی تھی' کرائے کے گواہوں کو جتنی خفت ہوئی تھی اس کے اثرات بہت دن تک پنجاب میں محسوس کیے جاتے رہے۔

رہائی کے بعد وہ اپنے والد سے ملنے اپنے گاؤں ناگڑیاں گئے۔ ایک بوڑھے باپ کے سامنے ایک بوڑھا بیٹا کھڑا تھا۔ مصائب کی گرد چہرے پر تھی۔ داڑھی اور سر کے بال سپید ہو چکے تھے۔ اس وقت ان کی عمر انچاس سال تھی لیکن وہ وقت سے پہلے بوڑھے دکھائی دینے لگے تھے۔ باپ نے اس حال میں بیٹے کو دیکھا تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن دوسرے ہی لمحے ایک فاتحانہ تبسم نے ہونٹوں پر جگہ بنا لی۔

"شاباش میرے بیٹے! میں سب کچھ اخباروں میں پڑھتا رہا ہوں۔ تو نے انگریز سے ٹکر لی اور خوب لی۔ یہ دو مقدمے تو ان کے کلیجے کا داغ بن گئے ہوں گے۔"

"اباجی' آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ سب ساتھ چھوڑ گئے ہیں' میں اکیلا کب تک لڑوں گا؟"

"حق کے راستے بڑے پتھریلے ہوتے ہیں۔ اس پر سب کہاں چل پاتے ہیں۔ یہی ہوتا ہے' یہی ہوتا رہے گا۔"

"میرے پاؤں لہولہان ہیں لیکن آپ کا حوصلہ دیکھ کر میں پھر سے تازہ دم ہو گیا ہوں۔"

"کچھ دن میری آنکھوں کے سامنے رہ لے پھر بھلے چلے جانا۔"

اہلیہ کی بیماری ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ گھر سے دور رہیں لیکن ان کا دشمن انہیں للکار رہا تھا اور وہ بزدلی کی زندگی جینا نہیں چاہتے تھے۔ کچھ دن گاؤں میں گزارنے کے بعد باپ کی دعائیں لیں اور پھر سفر پر چل دیے۔

لاہور آکر جماعتی کاموں کا جائزہ لیا اور پھر انگریزوں کے خلاف' دلوں کی بھٹیوں میں نفرت کا ایندھن بھرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ہندوستان کے ہر کوچہ و بازار میں گئے اور لاکھوں انسانوں کے اجتماع سے خطاب کیا۔

قراردادِ لاہور پاس ہو چکی تھی۔ مسلم لیگ کا مطالبہ

پاکستان زوروں پر تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت اس کے حق میں تھی لیکن عطاءاللہ شاہ کی رائے اس نعرے سے متصادم ہو گئی۔ وہ تقسیم ملک کے بعد کے نتائج سے مطمئن نہیں تھے۔

"کسی زمین کو حاصل کرنے سے پیشتر اللہ کا نظام اپنے دلوں پر قائم کریں۔ فرنگی کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی سے جو دل زنگ آلود ہو چکے ہیں، انہیں ایمان کی کسوٹی پر پرکھیں تاکہ کفر کے نظامِ حکومت کی جو آلائشیں اس پر جم چکی ہیں، وہ صاف ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی زمین آپ نے حاصل کر بھی لی تو جو نظام آپ قائم کریں گے وہ انسانوں کا بنا ہوا ہو گا جس کی ہر شق کفر کے آئین سے ماخذ ہو گی۔"

اس رائے کے بعد انہوں نے نہایت تنگ کوچے میں قدم رکھ دیا تھا۔ ہندو اور انگریز تو ان سے اختلاف رکھتے ہی تھے، اب انہوں نے ان مسلمانوں کو بھی اپنا مخالف بنا لیا جو مسلم لیگ کے حق میں تھے۔ ان کے جلسوں میں کھلم کھلا اظہارِ ناراضگی کی فضا نظر آنے لگی تھی۔

جنگِ عظیم کے بادل چھٹے تو اتحادیوں کو فتح ہو چکی تھی لیکن حالات ایسے ہو گئے تھے کہ برطانیہ تیسرے درجے کی طاقت بن کر رہ گیا تھا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات بھی برطانیہ کے حق میں نہیں تھے۔ یقین ہو چلا تھا کہ اب انگریز گھٹنے ٹیک کر ہندوستان کو تقسیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ منزل قریب نظر آئی تو امیرِ شریعت کو ایک مرتبہ پھر فکر دامن گیر ہوئی۔ انہوں نے دہلی میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"پاکستان کی تھیوری میرے بار بار سوچنے پر بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں جس قدر اس پر سوچتا ہوں، اسی قدر کھو جاتا ہوں لیکن اگر آپ کہتے ہیں کہ مسلمان قوم اور ہندوستان کی نجات بھی اسی میں ہے تو اس سلسلے میں میرے چند خدشات ہیں۔ اگر آپ مجھے ملاقات کا موقع دیں اور میرے خدشات دور کر دیں تو پھر آپ آرام سے بمبئی بیٹھ جائیں۔ میں آپ کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے حصولِ پاکستان کے لیے ہندو اور انگریز دونوں سے نمٹ لوں گا۔"

پھر وہ عوام سے مخاطب ہوئے۔

"آج میں آپ لوگوں کو گواہ کر کے یہ بات کہتا ہوں کہ اپنی بات سمجھنے کے لیے اگر مجھے مسٹر جناح کے قدموں میں اپنی یہ سفید داڑھی بھی رکھنی پڑی تو خدا کی قسم میں اس سے گریز نہیں کروں گا لیکن بات سمجھے بغیر ان کی ہاں میں ہاں ملانے پر تیار نہیں ہو سکتا چاہے میری قوم میرے خلاف ہو جائے۔"

ان خیالات کو پھیلانے کے لیے انہوں نے ہندوستان بھر کا دورہ کیا اور قائداعظم کی طرف سے بلاوے کا انتظار کرتے رہے۔ نہ ملاقات کا موقع آیا نہ ہندوستان کے مسلمان ان سے متفق ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء میں برطانوی مشن، مسلم لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں سے مذاکرات کے لیے دہلی پہنچا۔ عطاءاللہ شاہ بخاری نے بھی اپنی کلہاڑی سنبھالی اور دہلی پہنچ گئے۔ احرار کے رضاکار پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ شاہ جی، مشن کے سامنے اپنے خدشات کا اظہار کرنا چاہتے تھے اسی لیے ایسے موقع پر جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

آخری بہار کی طرح یہ بہار رنگ جمائے ہوئے تھی۔ اس شہر کی سڑکوں نے کیسے کیسے جلوس، لاؤلشکر، پرچم اور علم دیکھے ہوں گے لیکن یہ جوش و جذبہ دیکھنے کی چیز تھا۔ احرار کے رضاکار "اردو پارک" کے اردگرد انتظام سنبھالے ہوئے تھے جہاں یہ جلسہ ہونا تھا۔ سرخ پرچموں نے ماحول میں آگ سی لگا دی تھی۔ اندھیرا پھیلتے ہی قمقموں کی روشنی نے پارک کو نمائش بنا دیا۔ شاہی مسجد کے مینار خاموشی سے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔ لال قلعے کی دیواریں افسردہ تھیں۔

لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے نمازِ مغرب شاہی مسجد میں ادا کی۔ نماز ختم ہوتے ہی پیدل کارواں اردو پارک کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ ہر شخص کو جلدی تھی کہ وہ اگلی صفوں میں جگہ پائے۔ نمازِ عشا ختم ہوئی تو پارک سے باہر تک کی سڑکیں بھر چکی تھیں۔ انسانی سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو اپنے محبوب خطیب کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے موجود تھا۔

صبر اور میدان دونوں کا پیالہ جب چھلکنے لگا تو اعلان ہوا، حضرت سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری، امیرِ شریعت خطیبِ اعظم تشریف لے آئے ہیں۔ پانچ لاکھ کا مجمع سراپا نیاز اٹھ کھڑا ہوا۔ زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے دہلی کے در و دیوار جھوم اٹھے۔ جامع مسجد کے مینار کچھ دیر کے لیے مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ جذبات کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ خوشی کی محرابوں میں چراغ جلنے لگے۔ صدارت مولانا حسین احمد مدنی کے حصے میں آئی۔ اسٹیج سیکریٹری کے فرائض شیخ حسام الدین نے انجام دیے۔

ابھی آنکھوں نے جی بھر کے استقبال کے پھول نچھاور بھی نہیں کیے تھے کہ ایک دوسرا قافلہ آن پہنچا۔ حیرت کے دروازے کھل گئے۔ تعجب نے فرش بچھا دیا۔ اس قافلے میں برطانوی مشن کے سربراہ وزیرِ ہند لارڈ پیتھک لارنس، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لعل نہرو نمایاں تھے۔

ٹھیک بارہ بجے امیر شریعت نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کی۔ بھیگتی ہوئی رات میں مدنی لہجے نے رس گھول دیا۔ پانچ لاکھ کا مجمع سانس روکے بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی فرشتوں کے پروں کی سنسناہٹ سننے والوں کے دلوں میں کپکپی طاری کر دیتی تھی۔ ستارے بشریت کی انتہا کو حسرت سے تک رہے تھے۔

امیر شریعت نے نغمۂ ربانی کی آخری حدوں کو چھوا۔ ساعتوں کو واپسی کی اجازت ملی۔ بے خودی نے ہوش کی دنیا میں قدم رکھا۔ حیرت نے آنکھیں مل کر دیکھا تو پنڈت نہرو اسٹیج پر تھے۔

"میں تو صرف بخاری صاحب کا قرآن سننے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ برطانوی مشن کی آمد کے باعث بہت زیادہ مصروف ہوں۔"

عطاءاللہ شاہ بخاری نے انسانی سمندر پر ایک نظر ڈالی اور خلافِ معمول خطبۂ مسنونہ سے پہلے فرمایا "آپ حضرات درود شریف پڑھیں۔"

خوشبو کا جھونکا سا آیا اور چلا گیا پھر فرمایا "درود شریف پڑھیں" فضا پھر معطر ہوئی، تیسری بار فرمایا "درود شریف پڑھیں۔" عوام نے تکمیل کی لیکن قدرے حیرت کے ساتھ کیونکہ امیر شریعت کا طریقۂ تقریر یہ نہیں رہا تھا۔ انہوں نے اس حیرت کو خود ہی توڑا۔

"میں نے ایسا اس لیے کہا ہے کہ اتنے بڑے اجتماع کی موجودگی کے باوجود صبح یار لوگ اخباروں میں کہیں گے کہ رات مجمع تو پانچ لاکھ کا تھا مگر اس میں مسلمان کوئی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے درود شریف پڑھوالیا ہے تاکہ دوستوں کو اندازہ ہو جائے کہ اس مجمع میں مسلمان ہیں یا یہ مجمع مسلمانوں کا ہے۔"

یہ جلسہ ممکنہ پاکستان کے پس منظر میں تھا اور پاکستان کا تعلق مسلمانوں سے تھا اس لیے انہوں نے درود شریف کی گواہی کی چھاؤں میں اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

"حضرات! مجھے آج کوئی تقریر نہیں کرنی بلکہ چند حقائق ہیں جنہیں بلا تمہید عرض کروں گا۔ اس وقت جو بحث چل رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جدا کر کے برّصغیر کو دو حصوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ قطع نظر اس بحث کے کہ مجھے پاکستان بن جانے کا اسی قدر یقین ہے جتنا کہ اس بات پر کہ صبح سورج مشرق سے طلوع ہونے والا ہے لیکن یہ پاکستان وہ نہیں ہوگا جو اس وقت کے دس کروڑ مسلمانانِ ہند کے ذہنوں میں موجود ہے اور جس کے لیے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں۔ ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے..."

پھر اپنی کلہاڑی کو دونوں ہاتھوں میں اوپر اٹھاتے ہوئے فرمایا "ادھر مغربی پاکستان ہوگا، ادھر مشرقی پاکستان۔ درمیان میں چالیس کروڑ ہندوؤں کی حکومت ہوگی۔ لالوں کی حکومت۔ لالے دولت والے۔ لالے ہاتھیوں والے۔ ہندو اپنی عیاری اور مکاری سے پاکستان کو ہمیشہ تنگ کرے گا۔ اسے کمزور بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا..."

مستقبل سے نا آشنا نوجوان منہ کھولے، انجانے خدشات کو اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھ رہا تھا۔ امیر شریعت اپنی بصیرت کی روشنی میں حقائق کی پرتیں کھولتے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے اچانک اپنی تقریر کا رخ ہندو کی طرف موڑا۔

"پاکستان کی بنیاد، ہندو کی مسلمان دشمنی پر استوار ہوئی ہے۔ دولت سے پیار کرنے والے ہندو نے گائے کی پوجا کی، پیپل مہاراج پر پھول چڑھائے۔ سانپ کو اپنا دیوتا مانا لیکن مسلمان سے ہمیشہ نفرت کی۔ آج اسی نفرت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنا الگ وطن مانگنے پر مجبور ہوا ہے.... یہ کوڑھ کانگریس کے اندر سے پھوٹا ہے۔ جو بیماری جسم کے اندر سے پیدا ہو اس کا علاج باہر کے اثرات کیسے کر سکتے ہیں۔ اے کاش! ہم سے نہیں تو مسلم لیگ ہی سے نباہی ہوتی تاکہ آپس میں بیٹھ کر معاملات طے کر لیے جاتے۔"

ان کی یہ تقریر تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے جاری رہی۔ شاہی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اللہ سے بڑا کوئی نہیں۔ انہوں نے بھی اپنی آواز کو پست کر لیا۔ شاید اب کسی اور تقریر کا موقع نہ ملے۔ وقتِ وداع ہے، کون رہے کون بچھڑ جائے۔ ایک نماز تو سب ساتھ مل کر ادا کر لیں۔ ہندوستانی مسلمان بھی پاکستانی مسلمان بھی۔ اردو پارک ہی میں نمازِ فجر ادا کی گئی۔

۞☆۞

چہکتا ہوا بلبل کچھ دن کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر شاخِ آشیانہ خالی ہو گئی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے۔ گوشہ نشینی ان کی عادت تو نہیں تھی پھر کون سا گوشۂ عافیت انہیں پسند آگیا۔ بیوی بچوں سمیت ٹھکانا بدل لیا تھا اس لیے یقین تھا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ حالات کے رخ کو دیکھ کر الگ تھلگ ہو گئے ہیں۔ ایک ان پر ہی منحصر نہیں تھا، مجلس احرار کے بیشتر رہنما مسلم حقوق کی ذمے داری مسلم لیگ کو سونپ کر گوشۂ تنہائی میں چلے گئے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد گرمیاں گزارنے کشمیر آئے ہوئے

تھے اور گلمرگ میں رہائش پذیر تھے۔ انہیں کسی نے بتایا کہ عطاءاللہ شاہ بخاری "سوپور" میں ہیں۔ ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک دکان ہے، کبھی کبھی اس پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ اخبارات پر نظر ڈالتے ہیں اور اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ آزاد کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ انہوں نے پیغام بھیجا۔

"شاہ جی سے کہنا، زندگی اور موت کے مابین اب کوئی فاصلہ نہیں رہا۔ حالات نے دونوں کو جس ڈگر پر ڈال دیا ہے جانے اس سفر میں کس کی جیت ہو۔ اس لیے بہتر ہے کہ وقت نکال کر مل جائیں۔"

اس پیغام کا ملنا تھا کہ انہیں جانے کیا کیا یاد آ گیا۔ پیغام کا جواب آنسوؤں سے دیا۔ داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ ارادوں کی شکست نے پہاڑ کا دل موم کردیا۔ بے بسی بھی کیسی کیسی صورتیں اختیار کرتی ہے۔

تقریباً تین ماہ بعد جب وہ کشمیر سے واپس آئے تو برطانوی وفد واپس جا چکا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کشمکش کے ایک بحرانی دور سے گزر رہے تھے۔ حالات بظاہر پرسکون تھے کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے تقریر کا کنکر پھینکا۔ اندر کی بے سکونی سطح پر ابھر آئی۔ صاف نظر آنے لگا کہ اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ میرٹھ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"موجودہ فرقہ وارانہ لڑائی اگر ختم نہ ہوئی تو ان لوگوں کو جن پر حملے کا خدشہ ہے میں کہوں گا تلوار سے اپنی حفاظت کریں۔ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ غنڈوں سے اپنی حفاظت کریں۔ پولیس اور فوج پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ تلوار کا جواب تلوار ہے۔ میں لوگوں پر زور دیتا ہوں کہ حفاظت کے لیے طاقت کا استعمال کریں۔"

ارادے آئینہ ہوکر سامنے آگئے تھے۔ اشاروں کو زبان ملی۔ مندروں اور گوردواروں میں جن سنگھ اور اکالی پارٹی سامانِ حرب کے طریقۂ استعمال کی مشق کرنے لگے۔ ہندو محلوں کے سامنے آہنی دروازے لگادیے گئے۔ ریوالوروں، تلواروں، دستی بموں سے ہندو محلوں کو بھر دیا گیا۔

مسلمان ان منصوبوں سے بے خبر پاکستان بننے کی خوشی میں نعرہ زن تھے "لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان" جذبات کے بھنور پیروں میں تھے، تقدیر پر نظر جمی ہوئی تھی۔

شاہ جی نے کشتی کو دریا کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ جب شور زیادہ ہو تو کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ اب پاکستان بن رہا ہے تو اسے بننے دو۔ وہ گوشہ نشین ہو چکے تھے لیکن ہندوؤں اور سکھوں کی جانب سے اس حربی تیاری نے انہیں چوکنا کردیا۔ ان کی بالغ نظری نے بھانپ لیا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اب وہ خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ پھر انہیں میدان میں اترنا پڑا۔ وہ مسلمان نوجوانوں کو ہوشیار کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

"سکھوں کے گوردوارے ہندوؤں کے مندر جنگی قلعے بن گئے ہیں۔ سامانِ حرب سے لیس ہمسایہ قومیں تمہارے خون کی پیاسی ہیں۔ میں نے کبھی کہا تھا کہ اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرو۔ قومیں جب قصاص لینے پر آتی ہیں تو لحاظ نہیں کرتیں مگر تم نے میری ایک نہیں سنی۔ آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔

یاد رکھنا اگر اب بھی تم نے فیصلہ کرنے میں ڈھیل کی تو دریائے بیاس اور ستلج، پانی کے بجائے تمہارے خون سے بہیں گے۔ خدا نہ کرے اگر ایسا ہوا تو پھر مسلمانو! تمہاری عزت و آبرو کا خدا حافظ ہے۔ اپنے گھروں میں جس قدر سامانِ حرب جمع کرسکتے ہو، جمع کرو اور اپنی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو جاؤ۔"

وہ جوگیوں کی طرح پنجاب بھر میں مارے مارے پھرتے رہے۔ آج اس گلی میں کل اس موڑ پر۔ خطرات سے آگاہ کرتے رہے۔ کچھ نے ان کے اندیشوں کو محض خامِ خیال سمجھا۔ کچھ نے سنجیدگی سے بات سنی۔ کچھ انہیں پاکستان کا مخالف سمجھتے رہے۔ کسی نے مسلمانوں کا ہمدرد سمجھا۔ اسی کش مکش میں وقت آگے بڑھتا رہا۔ آنکھ تو تب کھلی جب ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی ہال سے باہر کرپان کو بے نیام کرکے فضا میں لہرایا اور اعلان کیا "جو مانگے گا پاکستان، اس کو دیں گے قبرستان۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ اسی شام امرتسر میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان خوں ریز فساد کی ابتدا ہوگئی۔ شاہ جی اس وقت امرتسر ہی میں موجود تھے۔ انہوں نے فوراً محلے کے تمام نوجوانوں کو اپنے گھر میں جمع کیا اور انہیں اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے تیار رہنے کی تلقین کی اور خود بھی تلوار سونت کر ان کے ساتھ پہرا دیتے رہے۔

امرتسر میں ایک دن ہی کا حملہ تو نہیں تھا۔ بے خبری میں لوگ مارے جاتے رہے۔ املاک نذرِ آتش ہوئیں۔ دو دن تک برابر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر تیسرے دن کرفیو لگا دیا گیا۔

سکھوں کے سر اٹھانے کی وجہ یہ تھی (جس کی کانگریس بھی درپردہ حمایت کر رہی تھی) کہ پاکستان کے قیام کی منزل

قریب آتی دیکھ کر انہوں نے پنجاب کی تقسیم کا نعرہ لگا دیا تھا۔ وہ ان فسادات کے ذریعے مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو نکال دینا چاہتے تھے۔

مجلس احرار اور خود عطاءاللہ شاہ بخاری بھی اس تقسیم کے سخت مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایسا ہوا تو مشرقی پنجاب کا مسلمان تباہ ہو جائے گا۔ اس وقت انہیں بے یارومددگار نہیں چھوڑا جا سکتا ورنہ سکھ اور ہندو مل کر انہیں نیست و نابود کر دیں گے چنانچہ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے لاہور میں پنجاب سوشلسٹ پارٹی اور مجلس احرار نے مشترکہ اجلاس کیا۔ شاہ جی جلتے ہوئے امرتسر سے نکلے اور لاہور پہنچ گئے اور خطرے کے پیشِ نظر اہل و عیال کو بھی ساتھ لیتے گئے۔

اس اجلاس میں انہوں نے نہایت پُردرد تقریر کی۔ مختلف دلائل کے ذریعے اس تقسیم کی مخالفت کی اور مسلم لیگ پر زور دیا کہ وہ پنجاب کی تقسیم کو کسی صورت میں بھی منظور نہ کرے۔

ان کی یہ آواز بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ فسادات کی آڑ لے کر کانگریس نے اعلان کر دیا۔

"پنجاب اور بنگال کی تقسیم ناگزیر ہے۔"

ہندو مہاسبھائی اس اعلان کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ گاندھی جی نے دبے لفظوں میں مخالفت کی لیکن آواز اتنی نیچی تھی کہ کسی نے سننے کی زحمت نہ کی۔ آخر وہ وقت آ گیا جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسلم لیگی اور کانگریسی رہنماؤں کے مشورے پر حکومت برطانیہ کا وہ تاریخی اعلان پڑھ کر سنایا جس کے مطابق برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ساتھ ہی پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر بھی اپنی مہر ثبت کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں اور ہندوؤں نے وہاں کی اقلیتی آبادی کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ وحشت و بربریت کا وہ ننگا ناچ ہوا کہ انسانیت نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ابھی پاکستان بنا نہیں تھا صرف اعلان ہوا تھا کہ پورا پنجاب خون میں نہا گیا۔ اُدھر کی خبریں اِدھر آتی تھیں تو خون سے تر ہوتی تھیں۔ خود ان کا مکان جو امرتسر میں تھا، آگ اور دھوئیں میں جل گیا۔ ان کی زندگی بھر کا سرمایہ، ان کی کتابیں لُٹ لٹا گئیں۔

وہ عطاءاللہ شاہ بخاری جو اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے برطانوی سامراج سے ٹکرا گئے تھے، اپنوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ جیل کی سختیوں نے جن کا حوصلہ نہیں توڑا۔ اپنوں کی لاشوں کو دیکھ کر کچی دیوار کی طرح بیٹھ گئے۔ اتنا روئے کہ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ تمام دن دفتر میں بیٹھے رہتے۔ گم صم دیواروں کو تکتے رہتے۔ کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا تو اسے اس طرح دیکھتے جیسے وہ کسی اجنبی زبان میں بات کر رہا ہو۔ مشورہ تو درکنار، وہ تو حالات کے بارے میں کچھ سننے کے روادار بھی نہیں رہے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہر معاملے سے لاتعلق ہو گئے ہوں یا زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہوں کہ دیکھا، جو میں کہہ رہا تھا، وہی ہوا۔

ان کے ہمدرد ان کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے۔ جو شخص پانچ پانچ گھنٹے مستقل بولتے نہیں تھکتا تھا، اسے یوں چپ لگ جائے۔ یہ حالت خطرے سے خالی نہیں تھی۔ یہی سوچا گیا کہ اگر یہ حالت رہی تو وہ کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ لاہور میں رہے تو اس صدمے سے باہر نکلنا بھی مشکل ہو گا۔ ان کے حق میں یہی بہتر ہے کہ لاہور کے بجائے کسی اور شہر میں رہیں تاکہ وہ اجڑے ہوئے مسلمان جو مشرقی پنجاب سے یہاں پہنچ رہے ہیں، وہ ان کی حالت کو آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں۔

نواب زادہ نصراللہ خاں، آل انڈیا مجلس احرار کے ناظم اعلیٰ تھے۔ انہوں نے ضد کر کے انہیں اپنے علاقے خان گڑھ بلا لیا۔ نصراللہ خاں، نواب زادہ تھے۔ اپنے علاقے کے رئیس تھے۔ ان کے پاس کس چیز کی کمی نہیں تھی چنانچہ عطاءاللہ شاہ بخاری خان گڑھ پہنچے تو یہ نعمت ان کا دسترخوان بن گئی۔ اس علاقے کے آموں کے باغات ان کے لیے جنت نگاہ تھے۔ خدمت کے لیے نوکر چاکر تھے لیکن حالات نے چھاتی پر ایسے داغ لگائے تھے کہ سکون نہ آتا تھا۔

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

حالات کی طرف سے پیٹھ موڑے بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی پلٹ کر دیکھتے تو دھول ہی دھول اڑتی نظر آتی۔ انہوں نے کیا کیا خواب دیکھے تھے لیکن ہر خواب نے بے وفائی کی۔ انہوں نے آزادی سے عشق کیا تھا لیکن آزادی کی قیمت یہ طے نہیں ہوئی تھی جو ادا کرنی پڑی۔ بہار آئی لیکن بادِ سموم کی سواری پر سوار ہو کر۔ آزادی سے پہلے سر چھپانے کے لیے مکان تو تھا۔ آزادی ملی تو گھر کے لیے ترس گئے۔

دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ ملی میرے آشیانے کو

کتب خانہ لٹ جانے کا غم اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ زندگی بھر کی ساتھی۔ نایاب کتابیں ان سے بچھڑ گئی تھیں۔ جب تک امید تھی اس وقت تک اپنی

قربانیوں کا شمار کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی لیکن اب امیدوں نے ساتھ چھوڑا۔ ایک ایک کرکے اپنی قربانیاں یاد آرہی تھیں۔ پچھتاوے کا احساس بڑھتا جارہا تھا۔ بچوں کے مستقبل کی فکر کھائے جارہی تھی۔

جب تک جوانی کا جن قابو میں تھا اس سے ہر کام لے لیا کرتے تھے۔ جوانی ڈھلی تو ارادے جوان ہوگئے۔ نہ دھوپ نے جلایا نہ شبنم نے بھگویا۔ نہ رات کی پروا کی' نہ دن کا لحاظ رکھا۔ جو فکر ہوئی اسے چٹکی سے اڑادیا۔ کسی بیماری نے حملہ کیا بھی تو مار بھگایا۔ دوڑتے رہے لیکن تھکن کا احساس تک نہ ہوا۔ اب جو خان گڑھ میں تھکن اتارنے بیٹھے تو دبی ہوئی چوٹیں ابھر آئیں۔ معلوم ہوا ذیابیطس ہے۔ احتیاط لازمی ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اچانک گردے میں درد اٹھا۔ ایسا شدید درد کہ تڑپنے کی طاقت بھی سلب ہوگئی۔ درد قابو میں آیا تو چہرے کا رنگ پیلا پڑچکا تھا۔ چند دن کے وقفے کے بعد اس درد نے پھر پریشان کیا۔ انجکشنوں نے انتقام لیا لیکن درد رہ رہ کر اٹھتا تھا۔

جسمانی اور روحانی صدموں نے حال یہ کیا کہ دانت ساتھ چھوڑ گئے۔ چہرے پر جھریوں کا جال بن گیا۔ آنکھوں کی چمک' ایسی چمک جیسے عقاب شکار پر جھپٹنے کی تیاری کرے' ماند پڑگئی۔ آنکھوں پر عینک لگ گئی۔ کمر خمیدہ ہوگئی۔ صرف ستاون سال کی عمر نے صدیوں کا سفر طے کرلیا۔

یہ مصائب کیا کم تھے کہ قسمت نے کہا لے' ایک دھچکا اور سنبھال۔ بڑا باہمت بنتا تھا۔ انگریزوں سے ٹکرا جانے والے عطاء اللہ شاہ بخاری! یہ صدمہ جھیل کر دکھا۔

ان کی سب سے چھوٹی بیٹی سالمہ جو ان کی سوگواری کا کھلونا تھی' بخار میں مبتلا ہوئی۔ ایک رات ان کے اندھیروں میں اضافہ کرکے اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔

"ننھی سالمہ! تو خوش نصیب ہے کہ تیرا باپ تیرے جنازے میں شریک ہے ورنہ تجھ سے پہلے تیری دو بہنیں ایسے عالم میں رخصت ہوگئیں جب میں آزادی کی طلب میں قید کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔ میں ان کی صورت بھی نہ دیکھ سکا۔"

انہوں نے قسمت کا یہ وار بھی سہہ لیا اور اس انتظار میں آسمان کی طرف دیکھنے لگے کہ شاید کوئی اور آفت بھی ہو جس کا نزول باقی ہو لیکن آسمان ان کی بے بسی پر مسکراتا رہا۔ بہت بڑے باپ کی بہت چھوٹی بیٹی کو بہت چھوٹے گاؤں میں دفن کردیا گیا۔

○*○

پاکستان بن چکا تھا۔ اس کی عمر ایک سال ہوچکی تھی۔ پرانے زخم بھلانے' نئی دنیا آباد کرنے کے دن تھے۔ سیاسی جنگ ختم ہوچکی تھی اب اس ملک کی فلاح وبہبود کے عملی قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ اس نئی فضا میں مجلس احرار کو اپنا مقام متعین کرنا تھا۔ آئندہ کے لیے پالیسیاں وضع کرنی تھیں۔ بکھرے ہوئے تنکوں کو پھر یکجا کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک میٹنگ ملتان میں طے ہوئی۔ کبھی کے روح رواں عطاء اللہ شاہ بخاری کو کون بھول سکتا تھا لیکن وہ خود کو بھولے ہوئے تھے۔ اس میٹنگ میں نہ جاسکے۔ صرف ایک خط کے ذریعے اپنی رائے کا اظہار کردیا۔ کچھ مشورے دے دیئے کچھ نصیحتیں کردیں۔

میٹنگ تو ہوگئی لیکن احرار کے رضاکاروں کی پیاس خط کے ایک پرزے سے کیسے بجھ سکتی تھی۔ رضاکاروں کا اصرار بڑھتا رہا۔ آخر اس بوڑھے شیر کو ملتان آنا پڑا اور جلسۂ عام سے خطاب بھی کرنا پڑا۔

دیکھنے کا سماں تھا۔ سیاہی مائل سرخ رنگ کا کرتا اور کھدر کی شلوار پہنے' آنکھوں پر عینک' سر پر سبز رنگ کی پگڑی رکھے وہ اسٹیج پر آئے تو عوام کے نعروں سے پنڈال گونج اٹھا۔ آج ان کے ہاتھ میں کلہاڑی کے بجائے ایک چھڑی تھی۔ اس کے سوا کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ خطاب شروع کیا تو آواز میں وہی گھن گرج تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"میرے بزرگو اور عزیزو! ایک سال کا عرصہ ہوگیا کہ میں نے کسی اجتماع میں تقریر نہیں کی۔ اب بھی خدا شاہد ہے کہ بادل ناخواستہ اٹھ کر آیا ہوں۔ اس ڈر سے کہ رضاکار ناراض نہ ہوجائیں ورنہ قریبًا تیس سال سے جو کچھ میں نے آپ سے کہا۔ اگر اسی کو سمجھ لیتے تو کافی تھا لیکن میری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔ میرا تو شکاری کتے کا سا حال ہے جو شکار کو دیکھ کر بھونکتا ہے ... اسی طرح میں دیکھ رہا تھا شکار کو اور تمہارے دروازے پر بھونکا۔ جس دروازے پر گیا اسی نے لاٹھی رسید کی۔ "بے ایمان سونے نہیں دیتا" حالانکہ میں جو کچھ دیکھتا تھا' اسی کی صدا لگاتا تھا۔

عزیزو! میری صحت خراب ہوگئی ہے کیونکہ میں نے حسین وجمیل دنیا اجڑتے دیکھی ہے۔ دلکش اور دلفریب دنیا' اچھی دنیا' بری دنیا' معزز بزرگ' معزز بیٹیاں' عصمت مآب بیٹیاں۔ سب اجڑے اور ہم سب کے ساتھ اجڑے۔

.... رضاکاروں کا ڈر تھا جو حاضر ہوگیا۔ ان کی منتیں کیں کہ بھائی' مجھے چھوڑدو۔ میں اب نہیں بول سکتا۔ ممکن ہے کوئی وقت ایسا آجائے کہ میں خود بول اٹھوں مگر انہیں سمجھائے کون۔ جی کی بات ہے' اب وہ بولنے نہیں دیتا۔ تیس

سال بولتا رہا ہوں۔ اب خدا سے دعا ہے جس نے تیس سال بولنے کی توفیق عطا کی کہ اب نہ بلوائے۔"

وہ نہ بولنے کی قسم کھا رہے تھے لیکن نوجوانوں کی دلداری کے لیے مسلسل بول رہے تھے۔ ہر چند کہ ان کی آواز، آوازِ شکست تھی مگر بول رہے تھے۔ ان کی تھکی ہوئی آواز، مایوس لہجہ، بجھے ہوئے چراغ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ عوام و خواص دونوں رو رہے تھے۔

ان کی یہ تقریر رات ڈیڑھ بجے تک جاری رہی۔ تقریر کیا تھی، قوم کو یہ احساس دلانا تھا کہ ابھی ہم زندہ ہیں ورنہ ابھی کوئی لائحہ عمل طے ہوا تھا نہ راستے کا علم تھا جس کو اختیار کرنے کی تلقین کرتے، جس پر چلنے کا حکم دیتے۔

اسی سال انہوں نے خان گڑھ کو خیرباد کہا اور ملتان کے ایک گمنام محلے بٹی شیر خاں میں تیس روپے ماہوار کرایہ کا مکان لے کر رہنے لگے۔ تھکے ہوئے مسافر کی طرح انہوں نے گوشہ نشینی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بٹی شیر خاں میں مسجد تھی، مسجد کے عقب میں ایک کچا سا مکان تھا جس کے باہر لیٹر بکس لگا ہوا تھا۔ یہی اس مجاہد، اس خطیبِ اعظم کا مکان تھا جس کی آواز کبھی ایوانِ برطانیہ میں ہلچل ڈال دیا کرتی تھی۔ اس گھر کا ایک دروازہ گلی کی طرف کھلتا تھا۔ جس میں ایک چارپائی پڑی تھی۔ یہ کمرا بادشاہِ خطابت کا محل تھا۔ کبھی اس بادشاہ کے حکم پر فیصلوں کا دارومدار ہوا کرتا تھا۔ وہ جب چاہتا لاکھوں کے مجمع کو رُلا دیتا، جب چاہتا ہنسا دیتا۔ آج یہ عالم تھا کہ اتنی بڑی زمین پر کوئی قطعۂ اراضی ایسا نہیں تھا جس پر وہ اپنا گھر بنا سکتا۔ کوئی نہیں تھا جو اس کی تنہائی بانٹنے اس سے ملنے چلا آتا۔

وہ گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ تنہائی سے آنکھ مچولی کھیلنے میں انہیں لطف آنے لگا تھا لیکن زندگی بڑی ظالم سواری ہے۔ سوار کو گراتی بھی ہے اور گر کر اٹھنے پر مجبور بھی کرتی ہے۔

مجلس احرار جس مقصد کے لیے وجود میں آئی تھی، وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ چکی تھیں۔ ذمے داران کے سامنے اب یہ سوال سر اٹھا رہے تھے کہ مجلس احرار اب اپنا وجود کیسے باقی رکھے۔ اس کا نعرہ کیا ہو، اس کے مقاصد کیا ہوں۔ ایک مرتبہ پھر اس گوشہ نشین کی یاد آئی۔ احرار رہنماؤں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اس نئی مملکت میں نئے زاویوں سے چلنے کی راہ سجھائیں۔

۱۹۴۹ء کے جنوری کے مہینے میں دہلی دروازہ لاہور کے میدان میں دفاعِ احرار کانفرنس کے عنوان پر احرار کا جلسہ ہوا جس میں پچاس ہزار احرار کارکن کی باوقار تعداد نے شرکت کر کے ماضی کی یاد دلا دی۔

اس کانفرنس کے تیسرے دن کے اجلاس میں شیخ حسّام الدین نے قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا۔

"یہ اجلاس غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کرنا اپنا ملّی فرض سمجھتا ہے کہ آئندہ سے مجلس احرار اپنی سعی و عمل کو مسلمانوں کے دینی عقائد و رسوم کو درست رکھنے اور خصوصاً مسئلۂ ختم نبوت کی مرکزی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے تبلیغی سرگرمیوں تک محدود رہے گی۔ جو اراکین و ہمدردانِ احرار زمانہ حال کے موافق سیاسی خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنے روایتی اخلاص اور عملی انہماک سے ملک و ملت کی خدمت میں حصہ دار بن سکتے ہیں۔

عطاءاللہ شاہ بخاری نے اس قرارداد کی تائید کی۔ اس کے بعد خطاب کیا۔ اس خطاب میں انہوں نے وقت کے تقاضے کے مطابق قیامِ پاکستان کے سلسلے میں مجلسِ احرار کی پوزیشن کو واضح کیا اور مجلس کے آئندہ کے عزائم کو واضح کیا۔

عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ مجلس احرار تقسیم ملک کے خلاف تھی۔ انہوں نے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے کہا۔

"مسلم لیگ سے ہمارا اختلاف صرف یہ تھا کہ ملک کا نقشہ کس طرح بنے۔ یہ نہیں کہ ملک نہ بنے بلکہ یہ کہ اس کا نقشہ کیونکر ہو۔ یہ کوئی بنیادی اختلاف نہیں تھا۔ نہ حلال و حرام کا نہ گناہ ثواب کا اور نہ مذہب کا۔ وہ تو ایک نظریئے کا اختلاف تھا۔"

"اب ہمارا مسلم لیگ سے کوئی اختلاف نہیں۔ نہ پہلے ہمارے اور ان کے درمیان مذہبی اختلاف تھا۔ نہ خدا کا نہ رسولؐ کا۔ یہ ہم ولی ہیں اور نہ لیگ والے قطب۔ ہمارا اور لیگ کا کوئی کفر اور ایمان کا اختلاف نہ تھا۔ یہ تو بالکل سطحی اختلاف تھا۔ ہم نے اپنی تیس سال کی کمائی حکومت اور مسلم لیگ کے حوالے کر دی۔"

مجلس کے آئندہ کے عزائم کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"مجلس احرار اب مذہبی اور اصلاحی کاموں میں سرگرم عمل رہے گی۔ مسئلۂ ختم نبوت اس کا بنیادی مسئلہ ہے۔ سیاست اب ہماری منزل نہیں۔ مسلم لیگ جانے اور اس کا کام۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلم لیگ کے پاس قوت ہے اور ہم اس قوت سے ڈر گئے ہیں۔ نہیں! نہیں! بلکہ ملک کی ضرورت اور حالات ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم متحد ہو کر بغیر

کسی اندرونی خلفشار کے پاکستان کی کمزور بنیادوں کی نگہداشت کریں۔"

استحکام پاکستان کے لیے اس سے نیک اور صائب مشورہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مشورہ انہوں نے خود کو بھی دیا اور اس پر عمل کرنے کے لیے لاہور سے ملتان، اپنے گھر لوٹ گئے۔ یہ مشورہ تھا، سیاست سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی کی زندگی۔ وہ ان دونوں پر عمل کر رہے تھے۔ آنا جانا چھوٹ گیا تھا۔ کمرے میں پڑی لوہے کی الماری کے ارگرد کتابیں پڑی رہتیں۔ وہ یادِ الٰہی میں مصروف رہتے یا مطالعہ کرتے رہتے البتہ شام کے وقت کچھ غیر سیاسی احباب جمع ہو جاتے جن میں شاعر و ادیب بھی شامل ہوتے۔

ایک دن ایسی ہی ایک محفل میں کسی کو شرارت سوجھی یا یہ سوچ کر سوال کر دیا کہ اسی بہانے ان کی خطابت کے مزے لُوٹے جائیں۔ وہ اب جلسوں میں تو نظر آتے نہیں، ان کی بیٹھک ہی کو جلسہ گاہ بنا لیا جائے۔

"شاہ جی! آج کل سیاست کیسی ہے؟"

"ریاست میں سیاست کیسی بابو۔ اپنے بال بچوں کا پیٹ پالو۔ اگر ہو سکے تو نیکی کرتے رہو اور مرجاؤ" شاہ جی نے نہایت صفائی سے سوال کو ٹال دیا۔

سوال کرنے والے نے دوسرے رخ سے حملہ کیا "شاہ جی! پہلے آپ مسلم لیگ کی مخالفت کرتے تھے اور اب حمایت؟"

"بھائی، ان دنوں حضرت حسینؓ کی سنت ادا کرتا تھا اور اب حضرت حسنؓ کی۔"

مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے مفتی محمد شفیع ایک دن ان سے ملنے آئے۔ دیکھا کہ شاہ جی مرغیوں کو دانہ کھلا رہے ہیں۔ مفتی صاحب یہ دیکھ کر محظوظ ہوئے اور ازراہِ مذاق فرمایا۔

"شاہ جی، یہ کام باقی رہ گیا تھا؟"

شاہ جی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور فرمایا "تیس سال تک میں نے آپ لوگوں کو بلایا ہے مگر آپ لوگ مجھ سے بھاگتے رہے۔ اب یہ بے زبان ہیں۔ ذرا سی آواز دیتا ہوں تو فوراً چلے آتے ہیں۔ اس دور کے انسانوں سے تو یہ حیوان کہیں بہتر ہیں۔"

اب یہ نوک جھونک کا ماحول ہی ان کی زندگی کی بہار بنا ہوا تھا یا شاعری کے پرانے ذوق کی یاد تازہ کرنے کے لیے اشعار جوڑنے بیٹھ جاتے۔ ان کے پاس آنے جانے والوں میں مقتدر شعرا بھی تھے جنہیں کلام سنا کر اور ان کا کلام سن کر وقت گزاری کر لیتے۔ کبھی کبھی گھریلو محفلوں میں مذہبی وعظ کے لیے چلے جاتے۔ اسی ڈگر پر چلتے ہوئے انہوں نے ۱۹۵۰ء تک کا زمانہ گزار دیا۔

ان کی گوشہ نشینی طول پکڑتی جا رہی تھی کہ اچانک وہ ایک روز منظرِ عام پر آ گئے۔ برسوں کے تجربے نے ان کی بصیرت کو ایک اہم اشارہ دیا۔ اب وہ اگر گھر میں بیٹھتے تو ملکی استحکام کا سوال تھا۔ پاکستان ابھی نو عمر پودے کی طرح تھا جسے آندھی سے بھی بچانا تھا اور تیز بارشوں سے بھی۔ اسے کمزور کرنے کے لیے بیرونِ ملک تیز آندھیاں چل رہی تھیں اور اندرونِ ملک بھی بارش کے آثار تھے۔ پاکستان کی بقا کا سوال آیا تو ان کی کمر سیدھی ہو گئی۔ وہ سینہ تان کر اسٹیج پر آ گئے۔

"جب بھی خطرے کی کوئی بات دیکھتا ہوں تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ باہر نکل کر بھونکتا ہوں کہ چور دیواریں توڑ رہے ہیں مگر تم چور کو دیکھتے نہیں، الٹا مجھے مارنے دوڑتے ہو کہ کم بخت سونے نہیں دیتا مگر کیا کروں، عادت سی بن گئی ہے۔"

"مرزا بشیرالدین محمود نے ایک الہام شائع کیا ہے جسے آج کل مرزائی بڑی تیزی سے ہوا دے رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ گاندھی آئے ہیں اور حضورؐ کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر لیٹنا چاہتے ہیں اور ذرا سی دیر میں اٹھ بیٹھے اور گفتگو شروع کر دی۔ اس کی تعبیر میں وہ خود ہی کہتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان اکٹھے ہو جائیں گے۔"

"میں تم سے پوچھتا ہوں مسلمانو! جس ملک کو دس ہزار بیٹیوں کی آبرو دے کر اور چالیس لاکھ مسلمانوں کی بربادی اور تباہی کے بعد حاصل کیا ہے، اسے کیا پھر ہندوستان کے ساتھ ملانے کے ارادے ہیں؟"

مسلمانو! مرزائیت کے یہی ناپاک ارادے مجھے گھر کی چاردیواری سے نکال کر تمہارے سامنے لے آئے ہیں ورنہ میں اب تھک چکا ہوں۔ میں ایک عظیم خطرے سے تمہیں آگاہ کرنے آیا ہوں۔ پاکستان کا یہ خود کاشتہ پودا، پاکستان میں بیٹھ کر بھی برطانیہ کی جاسوسی کر رہا ہے۔ میری حکومت نے اگر اس طرف توجہ نہ دی تو مجھے ڈر ہے کہ اس ملک پر مرزائیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔"

مرزائیوں کے پردے میں انہوں نے ہر اس دشمن کو للکارا جو پاکستان کے وجود کو متزلزل کرنے پر بہ ضد تھا۔ پھر اس خطرے کی طرف اشارہ کیا جو پاکستان کے لیے نقصان دہ تھا۔ مرزائی فتنہ سب سے بڑا خطرہ تھا جسے یقین تھا کہ پاکستان

کا وجود عارضی ہے اور یہ کہ ہمیں... کوشش کرنی چاہیے کہ یہ حالت جلد دور ہو جائے۔

وہ اب سیاست سے دور ہو چکے تھے۔ یہ تقریر بھی انہوں نے مذہبی فریضہ سمجھ کر کی تھی۔ ایک خطرے سے اپنی حکومت اور عوام کو آگاہ کرنا تھا۔ ممکن تھا کہ ان کے قدم یہیں رک جاتے لیکن سیاست اور مذہب نے اس طرح ساز باز کی کہ انہیں ایک کے دفاع کے لیے دوسرے کو اختیار کرنا پڑ گیا۔

صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں پنجاب مسلم لیگ نے اپنے امیدواروں میں چھ مرزائیوں کو شامل کر کے انہیں ٹکٹ دے دیے۔ اس پر احتجاج کرتے ہوئے مجلس احرار نے ایک پریس بیان جاری کیا۔

"مجلس احرار براہِ راست سیاست میں دخیل نہیں اور نہ ہی وہ سیاست میں حصہ لینا پسند کرتی ہے لیکن مسلم لیگ نے مرزائیوں کو ٹکٹ دیے ہیں۔ اب مجلس احرار ان کا مقابلہ کرنا اپنا دینی فرض سمجھتی ہے۔"

عطاء اللہ شاہ بخاری نحیف بھی تھے اور بیمار بھی لیکن یہ ضروری ہو گیا تھا کہ ان مرزائی امیدواروں کے راستے بند کیے جائیں۔ ان کے حلقوں میں جا کر ان کے فریب کے پردے چاک کیے جائیں۔ مسلمانوں پر ان کا اصل روپ ظاہر کیا جائے۔ یہ کام ان کے سوا کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ حالات کی ہوا نے نادانستگی میں انہیں سیاست میں دخیل کر دیا ورنہ اب تو وہ یہ کہنے لگے تھے "ریاست میں سیاست کیسی بابو۔ اپنے بال بچوں کا پیٹ پالو۔"

انہوں نے نہایت کروفر کے ساتھ ان قصبات کا دورہ کیا، جلسے کیے جہاں مرزائی امیدوار الیکشن میں حصہ لے رہے تھے۔ ان جلسوں اور تقریروں میں انہوں نے مرزائیت کے عزائم کا پردہ چاک کیا۔ لازمی طور پر مرزائیوں کے مذہبی عقائد بھی زیر بحث آئے۔

ان پُراثر تقریروں نے ایسا زور باندھا کہ مرزائی امیدواروں کی جلسہ گاہیں سنسان ہو گئیں۔ ان کے خلاف ایسی فضا بنی کہ جب الیکشن کے نتائج آئے تو تمام مرزائی شکست کھا چکے تھے۔

بیرونی آندھیوں میں سب سے بڑی آندھی ہندوستان تھا۔ اس نے سرحد پر فوجیں متعیّن کر دی تھیں اور جنگ تلی کھڑی تھی۔ شاہ جی نے الیکشن کے بکھیڑوں سے نمٹنے کے بعد نوجوانوں میں جہادی روح بیدار کرنے کے لیے طوفانی دورے شروع کر دیے۔ انہوں نے بہ بانگِ دہل کہا۔

"اگر اعلان جنگ ہوا تو بوڑھا بخاری بھی میدانِ جنگ میں کود پڑے گا۔ افسوس ضرور ہے کہ میں جوان نہیں لیکن دشمن کے مقابلے میں جوان ہوں۔ میری تمنا ہے کہ بستر پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے کے بجائے میدانِ جنگ میں جان دوں گا۔"

نوجوانوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس نہ دولت ہے نہ ثروت، صرف آپ کی خدمت میں پورے خلوص سے التجا کرتا ہوں۔ آپ کے پاؤں پر سفید داڑھی رکھ کر اپیل کرتا ہوں کہ آپ اسے منظور کریں اور وہ یہ کہ ایک جوان بھی ایسا نہیں رہے جو نیشنل گارڈ کی وردی نہ پہنے ہو۔"

ان کی تقریروں نے پورے ملک کو میدانِ کارزار بنا دیا۔ جوشِ جہاد کے جذبات بھڑک اٹھے۔ ملک کی سالمیت کا احساس دلوں میں جاگزیں ہو گیا۔

وہ گاؤں، قصبات، شہروں اور گلی کوچوں میں تقریریں کرتے پھر رہے تھے کہ راولپنڈی کے ایک اجتماع میں خان لیاقت علی خاں کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

ملک پر یہ وقت بڑا نازک تھا۔ بھارت کے جنگی ارادے بدستور قائم تھے۔ لیاقت علی خاں کی وفات نے اندرونی استحکام کو سخت دھچکا پہنچایا تھا۔

اپنی ذمے داریوں کو نبھاتے ہوئے مجلس احرار نے "استحکامِ پاکستان کانفرنس" کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے شاہ جی سرگودھا پہنچے۔ ان کی آمد کا اعلان ہوتے ہی پورا شہر ان کے استقبال کے لیے اُمڈ آیا۔

وہ ابھی اپنی قیام گاہ پر تھے کہ ایک دراز قامت شخص ان سے ملنے کے لیے آیا۔ یہ شخص اس وقت کمبل اوڑھے ہوئے تھا اور سیاہ عینک اس کی آنکھوں پر تھی۔ وہ اصرار کر رہا تھا کہ وہ شاہ جی سے اکیلے میں ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ شاہ جی کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ اس بات پر تیار نہیں تھے کہ شاہ جی کو اس اجنبی کے ساتھ بھیج دیں۔ کیا خبر کون ہے اور کیا چاہتا ہے جبکہ وہ شخص اپنی شناخت کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ آخر دوستوں کے مشورے کے برخلاف وہ اس اجنبی کے ساتھ دوسرے کمرے میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی اس شخص نے اپنا چہرہ ظاہر کر دیا اور ساتھ ہی اپنا تعارف بھی کرا دیا۔ اب شاہ جی کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ایک سرکاری آدمی تھا اور اس کی بات سنی جا سکتی تھی۔

"میں آپ کو ایک اہم راز بلکہ سازش سے آگاہ کرنے

آیا ہوں جو اس ملک اور اسلام کے خلاف کی جا رہی ہے۔"
"بھائی، اگر کوئی ایسا معاملہ ہے تو یہ حکومت کے اہم افراد کو بتانے کی بات ہے نہ کہ مجھے" شاہ جی نے کہا۔
"سازش میں شریک لوگ بھی حکومت میں شامل ہیں۔ اس لیے کارروائی ادھر سے نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں تو کر لیں ورنہ پھر وقت ہاتھوں سے نکل جائے گا۔"

"اچھا تو پھر اصل معاملہ بیان کیجئے۔"
اس شخص نے کہنا شروع کیا "راجا غضنفر علی (ایران میں پاکستان کے سفیر) اور سر ظفراللہ خاں (وزیر خارجہ) کے درمیان حال ہی کی ملاقات میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ اس وقت ہم دونوں اقتدار پر ہیں۔ کیوں نہ حکومت پاکستان سے ایسا قانون پاس کرالیں کہ پاکستان میں کوئی فرقہ کسی فرقے کو کافر نہ کہہ سکے اور آپ جانتے ہیں سر ظفراللہ قادیانی ہیں۔ وہ راجا غضنفر علی کی آڑ لے کر اپنے فرقے کو بچانا چاہتے ہیں۔ اس منصوبے پر کام شروع بھی ہو چکا ہے۔"
وہ شخص جیسے جیسے اس داستان کو بیان کرتا جا رہا تھا، شاہ جی کے چہرے پر سرسوں پھولتی جا رہی تھی۔ ان کی دور رس نگاہیں صاف دیکھ رہی تھیں کہ محلاتِ شاہی میں کیا منصوبہ بندی کی جا رہی ہے اور اس کے اثرات کیا مرتب ہوں گے۔
وہ شخص اٹھ کر گیا اور شاہ جی دوستوں میں آکر بیٹھے تو چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ دوستوں کے اصرار کے باوجود وہ یہ بتانے سے قاصر تھے کہ وہ شخص کون تھا اور کیا چاہتا تھا۔ اب انہیں جلسہ گاہ میں پہنچنے اور عوام سے خطاب کرنے کی جلدی تھی۔
اس رات وہ ذہنی طور پر ختم نبوت تحریک کا آغاز کر چکے تھے اور سمجھ چکے تھے کہ اب فرصت اور گوشہ نشینی کے دن رخصت ہوئے۔ اس فتنے کی بیخ کنی کے لیے اپنی صحت، اپنا بڑھاپا، اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کا وقت آگیا۔ اس رات ان کی تقریر ان کی جوانی کے لوٹ آنے کا اعلان کر رہی تھی۔ اصل تقریر سے ہٹ کر انہوں نے مرزائیت کو اپنا موضوع بنایا اور کسی خطرے اور مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سر ظفراللہ خاں کا جنازہ نکالنے کا اعلان کر دیا۔

۞✲۞

ختم نبوت کی تحریک پاؤں پاؤں چل رہی تھی۔ ابھی اس میں شدت نہیں آئی تھی حالانکہ شاہ جی نے اس فتنے کے سدّباب کو وظیفۂ جاں بنالیا تھا۔ مغربی پاکستان کی حد تک یہاں کے عوام کو اپنی تقریروں سے اس قدر مشتعل کر دیا تھا کہ ایک چنگاری اسے شعلہ بنا سکتی تھی لیکن انہوں نے ابھی تک اس تحریک کو تشدد سے دور رکھا تھا۔ ان کا کسی سے جھگڑا نہیں تھا۔ انہیں تو اپنی تقریروں کے ذریعے یہ ثابت کرنا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کوئی نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔
"جب مسیلمہ کذاب نے نبوّت کا دعویٰ کر کے اسلام کے بنیادی عقیدے کو گزند پہنچانے کی ناپاک کوشش کی تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کاذب و مفتری سے کسی قسم کا مناظرہ کر کے دعویٰ نبوت کے جواز میں دلیل طلب نہیں کی۔ اگر کیا تو یہ کہ سات ہزار سے زائد حافظِ قرآن صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین ناموسِ رسالت اور تاج و تخت ختم نبوت پر قربان کر دیے اور اس طرح مسلمان کی متاع دین و ایماں کو ایک عیار اور مکار کی دست بُرد سے بچا لیا اور آئندہ کے لیے ملتِ اسلامیہ کو سبق دیا کہ جو شخص اس قسم کی ناپاک کوشش کرے، اس کے لیے اسلام اور ملتِ اسلامیہ کا فیصلہ کیا ہے؟"
ایک اور موقع پر انہوں نے کہا۔
"حضرت محمدؐ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور سلسلۂ نبوت کے ختم کرنے والے ہیں۔ اگر حضورؐ کے بعد کسی اور نبی کو آنا ہوتا اور سلسلۂ نبوت جاری رہنا ہوتا تو حضورؐ یہ اعلان نہ فرماتے "میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔"
یہ انتہائی کمینہ اور گستاخانہ جملہ ہے کہ ایک انگریز کا پروردہ اٹھ کر یہ اعلان کرے کہ قرآن پاک کی وحیِ الٰہی میں میرا نام محمد رکھا گیا اور رسول بھی۔"
یہ اور ان جیسی تقریروں کا کوئی سیاسی مقصد نہیں تھا اور نہ ہی انہیں حکومت سے کوئی پرخاش تھی۔ یہ خالص مذہبی تقریریں تھیں جن کے مخاطب عوام تھے۔ عوام پر صحیح صورت حال واضح کرنا مقصود تھی اور اس فتنے سے ہوشیار رہنے کے لیے انہیں ابھارا جا رہا تھا۔
یہ حالات تھے کہ اچانک حکومت نے اپنے آپ کو اس میں ملوث کر لیا۔ جہانگیر پارک کراچی میں مرزائیوں کا سالانہ اجتماع ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہر پاکستانی دنگ رہ گیا کہ پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفراللہ خاں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ بطور قادیانی اس اجتماع سے خطاب بھی کیا۔
مرزائیوں کے خلاف شاہ جی تقریروں نے جو فضا بنا دی تھی اس تناظر میں سر ظفراللہ خاں نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ اگر ایک طرف مرزائیوں کی حوصلہ افزائی ہوئی تو

مکمل ہوگیا۔ خواجہ ناظم الدین کی حکومت ختم ہوگئی۔ ان کی جگہ محمد علی بوگرہ کو نیا وزیراعظم مقرر کردیا گیا۔ دولتانہ کا پتا بھی صاف ہوگیا۔

حکام بالا ان کھیل تماشوں میں مصروف تھے۔ عوام، پولیس اور فوج سے دست وگریباں تھے کہ عطاءاللہ شاہ بخاری کو کراچی سے سکھر جیل منتقل کردیا گیا۔

سکھر جیل وہ جگہ تھی کہ جرائم پیشہ عناصر بھی پناہ مانگتے تھے۔ مچھر اور کھٹمل اس جیل خانے کی خاص سوغات تھے۔ موسم گرما میں سندھ کی تپتی ہوئی ریت آگ اگلتی تھی تو یہ جیل جہنم کدہ بن جاتی تھی۔

عطاءاللہ شاہ بخاری نے اس جیل میں قدم رکھا تو موسم گرما اپنے شباب پر تھا۔ اونٹوں کے پاؤں جلنے کے دن تھے۔ گناہوں کی فہرست پیش کیے بغیر انہیں اس جہنم کے حوالے کردیا گیا۔

"میں غسل کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس جیل میں ایک قیدی کو ایک لوٹا ملتا ہے، اس ایک لوٹے سے نہالو۔"

"ایک لوٹے سے کون نہا سکتا ہے؟"

"مجبوری ہے۔ یہاں کا یہی قاعدہ ہے۔"

"مجھے تو وضو کے لیے بھی پانچ لوٹے روز کی ضرورت پڑا کرے گی۔"

"وہ تمہارا مسئلہ ہے۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔"

"ایسا ظلم تو کبھی انگریز نے بھی نہیں کیا۔ تم لوگ تو مسلمان ہو۔ ہم سیاسی قیدی ہیں۔ عادی مجرم نہیں۔ میں نے جو تحریک چلائی ہے، خالص مذہبی نوعیت کی ہے۔ حکومت سے میرا کوئی جھگڑا نہیں۔"

وہ جیل کے کارندوں سے الجھتے رہے لیکن وہ حکومتی احکامات کے بغیر کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں تھے۔ شاہ جی نے تیمم کیا اور اللہ کے حضور سربہ سجود ہوگئے۔

کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ دو روٹیاں چاول کے آٹے کی، گھاس پھوس اور تیل کے بگھار کی سبزی، مسور کی دال کا پانی۔ جیل کا ملازم آیا اور یہ دسترخوان ان کے سامنے سجادیا۔ قیدی اس سامان پر ٹوٹ پڑے لیکن وہ حیران تھے کہ اسے کس طرح زہر مار کریں۔

انہیں انگریز کے زمانے کے جیل خانے یاد آگئے۔ وہ بدیسی لوگ تھے لیکن وہ لوگ تعلیم، شہرت، خاندانی رکھ رکھاؤ وغیرہ کو مدنظر رکھ کر برتاؤ کیا کرتے تھے لیکن یہاں تو سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا جارہا تھا۔

اس خوراک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے شوگر کے مرض میں اضافہ ہوگیا اور درد گردہ بھی عود کر آیا۔ جب تک "بی" کلاس کے کاغذات آتے اور بہتر خوراک ملتی، وہ اپنی بہت سی توانائی ضائع کرچکے تھے۔ بینائی پھر بھی اثر ہوا۔

کراچی جیل میں ان کے پاس دو الگ الگ پیغامات آئے تھے۔ سکھر جیل میں خود وزیراعظم محمد علی بوگرہ تشریف لے آئے۔ بات اب پیغام کی نہیں تھی، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات ہورہی تھی۔

"آپ حضرات اگر اپنی تحریک کے سلسلے میں حکومت کے روبرو معذرت کردیں تو آپ کو رہا کردیا جائے گا۔ میں اسی کام کے لیے آپ سے ملنے آیا ہوں۔"

اسیرانِ قفس کے لیے یہ پیش کش نئی نہیں تھی۔ اس مرتبہ پھر شاہ جی نے پہل کی اور دو لفظوں میں داستان بیان کردی۔

"آپ حضرات کو ہماری اتنی فکر کیوں ہے؟" اور پھر یہ شعر پڑھ دیا۔

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا
کیے جاؤ مے خوارو کام اپنا اپنا

وزیراعظم نے یہ شعر سنا۔ تھوڑی دیر ٹھہرے اور واپس چلے گئے البتہ اتنا ہوا کہ جیل کے حکام کو ان قیدیوں کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا اور ان کے ساتھ کچھ بہتر سلوک ہونے لگا۔

ان کی گرفتاری کو چار مہینے گزر چکے تھے لیکن طاقت سے دبائی ہوئی گردنوں سے ہروقت سربلند ہونے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ حکومت کو بھی یہ خطرہ لاحق تھا کہ نہ جانے کب دبی ہوئی آگ شعلہ بن کر بھڑک جائے لہٰذا ایسے عوامل تلاش کیے جائیں جن کا سدِباب کرکے اس ہنگامے پر ہمیشہ کے لیے قابو پایا جاسکے۔ اس کے لیے عدالتی تحقیقات ضروری تھی۔ جسٹس منیر اور مسٹر ایم آر کیانی پر مشتمل ایک ڈویژن بینچ مقرر کیا گیا جس نے یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو اپنی کارروائی کا آغاز کیا۔

مجلس احرار چونکہ اس مقدمے کی ایک اہم حریف تھی اور مجلس کے رہنما مختلف جیلوں میں قید تھے لہٰذا ان سب کو ایک جگہ جمع کرنے کی غرض سے لاہور سینٹرل جیل منتقل کردیا گیا۔ عطاءاللہ شاہ بخاری کو بھی لاہور جیل لایا گیا۔ ان کی آمد سے جیل کی دیواریں یوں چمک گئیں جیسے نیا رنگ و روغن ہوا ہو۔ سکھر جیل کی سختیوں نے ان کے مزاج کی بہار کو خزاں میں تبدیل کردیا تھا لیکن ان کی زندہ دلی نے دیگر اسیرانِ قفس کی زندگی میں نئے شگوفے کھلا دیے۔

وہ صاحبِ رائے بھی تھے اور قادر الکلام بھی۔ انہوں

نے اپنے ساتھی علما پر اپنا مؤقف اس طرح واضح کیا۔
"اگر میری مانو تو ہمیں کمیشن سے عدم تعاون کا اعلان کردینا چاہیے۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"
"ایک فریق کو آزاد اور دوسرے کو سلاخوں میں بند کرنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اربابِ حکومت اپنا فیصلہ صادر فرما چکے ہیں۔ میری مانو تو اپنی زندگی کا باقی حصہ قید و بند کی نظر کردو اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردو۔ وہ بہتر کارساز ہے لیکن اگر آپ حضرات اس کے لیے آمادہ نہ ہو سکیں تو میں آپ کے فیصلے کا پورا پابند رہوں گا اور انشاء اللہ اس پر عمل کروں گا۔"

ان کی اس تقریر کے باوجود دوسرے ساتھیوں کا اصرار بھی رہا کہ ہمیں تعاون کرنا چاہیے اور نتائج سے بے پروا ہو کر من حیث الجماعت تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنا مؤقف پیش کردینا چاہیے۔
جیل میں جس طرح دن گزر سکتے ہیں، گزر رہے تھے کہ ایک دن مولانا داؤد غزنوی ایک تحریری بیان لے کر آئے۔ اہلِ اقتدار نے سوچا ہو گا کہ لوہا ہی لوہے کو کاٹ سکتا ہے۔ مولانا کے پاس مولانا کو بھیجو۔
بیان کا متن یہ تھا۔
"تحریکِ ختم نبوت کو چلانے کا ہمارا اس طرح کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی آئندہ ہم ایسی کسی تحریک کے چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ماضی قریب میں جو کچھ ہوا اس پر عوام کو زیادہ دخل تھا۔ ہم حکومت کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ہم ایسی کوئی تحریک نہیں چلائیں گے۔"
یہ بیان وزیر اعلیٰ ملک فیروز خان نون نے تیار کرکے بھیجا تھا اور یقیناً ان ہی سازشوں کا حصہ تھا جو اب تک ہوتی رہی تھیں۔ ان سازشوں میں اپنے پرائے سب شریک تھے۔
اس تحریر پر غور کرنے کے لیے ایک دن کا وقت مانگا گیا۔ تمام علما نے اس تحریر پر غور کیا۔ سب کے الگ الگ فیصلے تھے۔ شاہ جی کا فیصلہ اس مرتبہ بھی سب سے انوکھا تھا۔
"اس تحریر پر دستخط کرنے سے بہتر ہے کہ ہم جیل کے غیر اخلاقی قیدیوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں۔ یہ تحریر ہماری سیاسی اور مذہبی موت کے مترادف ہے۔"
یہ فیصلہ سب کو پسند آیا چنانچہ دوسرے دن مولانا داؤد غزنوی جواب لینے آئے تو انہیں نہ صرف ناکام لوٹنا پڑا بلکہ شاہ جی سے ان کی تلخ کلامی بھی ہوئی۔
سازشیوں کے ساتھ ساتھ ہمدرد بھی سرگرمِ عمل تھے اور حکومت کی کمزوریوں کی ٹوہ میں لگے ہوئے تھے۔ میاں

محمود علی قصوری، بار ایٹ لا کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ تحریکِ ختم نبوت سے ان کی ابتدائی معیاد نظر بندی (چھ ماہ) کے ختم ہونے پر دوسرے نوٹس کی تعمیل نہیں کرائی گئی ہے، انہیں یہ موقع مل گیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر لاہور ہائیکورٹ میں رٹ دائر کردی اور ان کی گرفتاری کو غیر قانونی ثابت کردیا۔ بات معقول تھی۔ شاہ جی سمیت تمام علما جیل سے باہر آگئے۔
ان کی صحت تمام جسم سے بغاوت کر چکی تھی۔ سکھر جیل کی سختیوں نے ان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تمام دوستوں کو یقین تھا کہ اب وہ اپنی باقی عمر چارپائی پر گزار دیں گے لیکن جس کی پوری زندگی محفلوں اور مناظروں میں گزری ہو، تنہائی کی چاردیواری میں کب تک رہ پاتے۔ چند دن بستر پر لیٹنے کے بعد دوستوں کی محفل میں بیٹھ گئے۔ دن بھر ملنے والوں کا ہجوم لگا رہتا۔
یہ بھی ایک قسم کا آرام ہی تھا لیکن آرام کا لفظ انہیں راس آتا ہی نہیں تھا۔ احباب کے اصرار پر ملتان کے ایک خصوصی اجلاس میں انہیں مجلسِ تحفظِ ختم نبوت کا صدر منتخب کرلیا۔
"بھیا! اب میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان کب رہی ہے کہ میں یہ بوجھ اٹھا سکوں۔" انہوں نے کہا۔
"ہمیں تو آپ کی رہنمائی چاہیے ہے۔ آپ اپنی بیٹھک میں بیٹھے بیٹھے ہمیں ہدایات جاری کرسکتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے بھیا! جیسی تمہاری مرضی۔"
انہوں نے صدر منتخب ہوتے ہی پریس بیان جاری کرکے اپنے عزائم کا اظہار کردیا۔
"مسئلہ ختم نبوت جانِ اسلام اور روحِ قرآن ہے۔ اگر مسلمان عقیدۂ ختم نبوت سے بال برابر اِدھر اُدھر ہو جائیں گے تو پھر محمد عربیؐ کا قرآن باقی رہتا ہے اور نہ ہی خدا تعالیٰ کا وہ تقدس اور توحید باقی رہتی ہے جن پر آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ختمی المرتبت تک تمام انبیا علیہ السلام متفق ہیں۔ مرزائیت اس روح پر اس جانِ قرآن اور جانِ اسلام پر مرتدانہ ضرب ہے۔ میں اس کے استحصال کو ہر مسلمان کے لیے فرض جانتا ہوں اور اپنی زندگی کی آخری بازی۔"
وہ احباب کی نصیحت پر عمل پیرا ہو کر چند ماہ ہی اپنی بیٹھک تک محدود رہ سکے۔ ملک کے سیاسی حالات روز بہ روز ابتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ مجلس احرار نے سیاست سے کنارہ کشی کرلی تھی لیکن ان حالات نے تحریکِ ختم نبوت پر بھی اثر ڈالا تھا لہٰذا اب وہ خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔
انہوں نے پورے مغربی پاکستان کا دورہ کرکے تقریریں

کیں اور فضا کو گرما دیا۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے لیکن کفر کے ارتداد کے لیے تنومند تھے۔ سننے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ بوسیدہ ہڈیوں میں کون سا پنچھی بند ہے کہ تھکتا ہی نہیں۔ کئی کئی گھنٹے تقریریں کرتے ہوئے ان کا گزر گوجرانوالہ میں بھی ہوا۔ شیراں والا باغ میں ان کے خطاب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ باغ کا دامن عوام سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اچانک کالی گھٹاؤں نے آسمان کو گھیر لیا۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ بارش تلی کھڑی تھی۔ اندیشہ تھا کہ سب انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ بارش ہو گئی تو جلسے میں پانی کے سوا کیا بچے گا۔ وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو پہلی بوند نے استقبال کیا۔

"کیوں بھئی، کیا ارادے ہیں؟ اگر بارش سے ڈر کر بھاگ جانا ہو تو ابھی سے کہہ دو ورنہ بخاری تو کھڑا ہے۔"

زمین پر بخاری اور آسمان پر بادل کھڑے تھے۔ نہ وہ ہٹتے تھے، نہ یہ ہٹتے تھے۔ بادل گرجے تو عوام نے بہ یک زبان کہا "ہم بیٹھیں گے شاہ صاحب!"

بارش کے ساتھ ساتھ امیر شریعت بھی برس رہے تھے۔ تقریر کا جادو ایسا تھا کہ عوام کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ بارش موسلا دھار ہو رہی ہے۔ باغ میں پانی بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ لوگ اسی طرح جمے ہوئے تھے۔ یہ ان کی مقبولیت کا نیا انداز تھا۔

جب پانی بیٹھے ہوئے لوگوں کی کمر تک آگیا تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بھاگنے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ اب کھڑے ہو کر تقریر سنیں گے۔ شاہ جی دیکھ رہے تھے اور لطف اندوز ہو رہے تھے پھر انہیں عوام کی حالت پر ترس آگیا۔

"بس بھائی! اب میں آپ کا اور امتحان نہیں لیتا۔ یہ بھی ایک ریکارڈ رہے گا میری زندگی کا۔"

عوام کا اصرار تو اب بھی تھا، وہ مزید بھیگنے کو تیار تھے۔ اپنے عظیم لیڈر کے خلوص کو پہچانتے تھے۔ لہجے کا لوچ، لفظوں کا بانکپن، آواز کا حسن۔ باتوں کا وزن عوام کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ بیٹھے رہیں اور پانی ان کے سروں سے گزر جائے لیکن جب تقریر رک گئی تو انہیں بھی ہوش آگیا۔ جلسہ ختم ہو گیا اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

حکومت ان کی اس مقبولیت کو خطرے کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اس خطرے کو روکنا ضروری تھا۔ حالیہ تقریروں نے حکومت کو چوکنا کر دیا تھا۔ انہیں ایک نوٹس ملا "آپ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ملتان کی عدالت میں حاضر ہوں۔"

ان احکامات کی تکمیل کے لیے انہیں عدالت میں جانا پڑا۔ مجسٹریٹ نے صرف اتنا کہا "آپ اپنی تقریروں کا لہجہ نرم رکھیں۔" انہوں نے بھی اس مختصر حکم کی تعمیل ایک مسکراہٹ سے کی اور عدالت سے نکل آئے۔

نہ آواز بدلی نہ انداز بدلے۔ وہ ان دھمکیوں سے مرعوب ہونے والے نہیں تھے۔ جس بات کو حق سمجھتے تھے، اسے بہ بانگِ دہل کہتے تھے۔ ان کی تقریریں اسی طرح جاری رہیں۔ ان کی سرگرمیاں مذہبی تقریروں تک محدود تھیں لیکن حکومت کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ انہیں ایک حکم نامے کے تحت ملتان کی میونسپل حدود میں نظر بند کر دیا گیا۔

اس نظر بندی نے وقتی طور پر انہیں یہ موقع دے دیا کہ وہ اپنے علاج میں یکسوئی سے مصروف ہو جائیں۔ برسوں کی تھکن اتارنے کے لیے کچھ گھڑیاں پس انداز کر سکیں لیکن ان کا مؤقف ان کا مشن انہیں مجبور کرتا رہا۔

حکومت کو بھی اس وقفے سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ گڑے مردے اکھڑنے لگے۔ پچھلی تقریروں پر یکے بعد دیگرے کئی مقدمات کے تحت ان کی گرفتاری اور رہائی ہوتی رہی۔

مجلس احرار نے نظر بندی کے اثر کو زائل کرنے کے لیے ان کی سرپرستی میں روزنامہ "نوائے پاکستان" نکالنے کا فیصلہ کیا۔ بہت دن بعد اس روزنامے کے ذریعے لوگوں نے ان کے خیالات سنے۔

"ہمیں ملک کے سیاسی بکھیڑوں میں الجھنے اور پھنسنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پیش نظر صرف ایک ہی مؤقف ہونا چاہیے اور وہ حضور ختم المرسلینؐ کی نبوت کا تحفظ۔ اس کے علاوہ جو باتیں ملحوظ رکھنی ضروری ہیں وہ پاکستان کی عمومی خدمت اور جمہور المسلمین کو ان گمراہیوں سے نکالنا ہے جو ان کے عقائد و اعمال میں جڑ پکڑ چکی ہیں۔

اس روزنامے کے ذریعے وہ لوگوں سے مخاطب ہوتے رہے۔ اپنے خیالات پہنچاتے رہے لیکن زبان بندی کی گھٹن نے ان کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ دو مرتبہ فالج کے حملے ہو چکے تھے۔ ان حملوں کو انہوں نے اپنی قوتِ ارادی سے ناکام بنا دیا تھا۔ بھوک کی کمی، اختلاج قلب اور تبخیر معدہ کی شکایت بڑھ گئی تھی۔ بے چینی کے عالم میں مسلسل ٹہلتے رہتے۔

ملتان کے حکیم عطا اللہ دل و جان سے ان کے علاج میں لگے ہوئے تھے لیکن مرض میں افاقہ نہ ہوتا تھا۔ علاج کے لیے لاہور جانا چاہتے تھے لیکن نظر بندی کے احکامات حائل تھے۔ بالآخر ان کی بیماری کو جواز بنا کر نظر بندی کے احکامات کو

عدالت میں چیلنج کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے میاں محمود علی قصوری ایڈووکیٹ کی خدمات حاصل کی گئیں۔
ابھی یہ مقدمہ ابتدائی مراحل میں تھا کہ اخبارات کے ذریعے انہیں اپنی رہائی کی خبر ملی۔
"ڈاکٹر خاں صاحب وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان نے امیرِ شریعت سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری پر عائد تمام پابندیاں اٹھالیں۔ حکام نے یہ قدم حضرت امیرِ شریعت کی خرابیِ صحت کی بنا پر اٹھایا ہے۔"
مقصد پورا ہو گیا تھا لہٰذا مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ اب کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی۔ دوستوں کا اصرار پہلے ہی تھا۔ انہوں نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ لاہور جا کر علاج کرایا جائے۔ کئی دوستوں نے اپنے دروازے کھول دیے تھے لیکن وہ بادامی باغ میں حاجی دین محمد کے گھر ٹھہرے۔
ان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی احباب کا میلہ لگ گیا۔ ان کے معالج نے آرام کا مشورہ دیا تھا لیکن پھول ہو اور بھنورے نہ منڈلائیں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ شاعروں نے گھر دیکھ لیا۔ شاہ جی شعر بھی کہتے تھے لہٰذا غزلیں سنی اور سنائی جانے لگیں۔ سیاست داں چکر لگانے لگے۔ علما کا ہجوم رہنے لگا۔ شاہ جی اپنی عادت سے مجبور تھے۔ ہر بات کا تفصیل سے جواب دیتے۔ گھنٹوں بولتے اور نہ تھکتے۔ رات بھر قندیلیں روشن رہتیں۔ پروانوں کا مجمع لگا رہتا۔ لاہور زندہ دلوں کا شہر اور شاہ جی سوز زندہ دلوں کے ایک زندہ دل۔
حکیم اجمل خاں کے پوتے حکیم نبی جمال خاں سویدا کا علاج شروع ہوا۔ علاج بھی ہوتا رہا، انجمن میں قہقہے بھی بلند ہوتے رہے۔ مرض میں افاقہ کہاں سے ہوتا۔
ایک ہفتے بعد ڈاکٹر کرنل محمد ضیاء اللہ کا علاج شروع کیا۔ ڈاکٹر عموماً خاموشی سے علاج کرتے رہتے ہیں، مریض کو نہیں بتاتے کہ بیماری کا سبب کیا ہے لیکن شاہ جی تو شاہ جی تھے۔ انہوں نے ضد کر کے پوچھ ہی لیا۔
"آپ کی تشخیص نے مرض سے متعلق کیا فتویٰ دیا؟"
ڈاکٹر صاحب نے بھی خوب جواب دیا "شاہ جی! آپ اپنا کوٹا ختم کر چکے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو سو سال کی زندگی عطا کی تھی جسے آپ نے پچاس سالوں میں ختم کر لیا۔ اب تو کوشش ہی ہے۔"
"آپ اپنی کوشش سے مطمئن ہیں؟"
"آپ کے معمولات کو دیکھ کر تو قطعی مطمئن نہیں۔"
"کیا مطلب؟"
"آپ کے پاس ہر وقت لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے جو آپ جیسے مریض کے لیے قطعی مفید نہیں۔"
"کیا کروں میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ دوست، دشمن سب کا استقبال کرتا ہوں۔"
"میں استقبال کو منع نہیں کرتا لیکن یہ محفلیں دل بہلانے کی حد تک ہوں تو اچھا ہے۔"
آخر ڈاکٹر کے مشورے پر دوستوں سے ملنے کے لیے عصر اور مغرب کے درمیان کا وقفہ طے کر لیا گیا۔ اس قید سے یہ فائدہ ہوا کہ صرف مخصوص لوگ آنے لگے جو کسی طرح ان کے لیے زحمت کا باعث نہ بنتے۔ اس احتیاط نے اثر دکھایا اور رفتہ رفتہ ان کی صحت بحال ہونے لگی۔ تین مہینے بعد وہ لاہور سے ملتان چلے گئے۔
انہوں نے زندگی بھر کسی جسمانی اذیت کو اذیت نہ سمجھا۔ ہر مصیبت کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑے ہو گئے۔ انہیں اپنے جسم پر اختیار تھا لیکن روح پر نہیں تھا۔ پے در پے کئی واقعات ایسے ہوئے کہ ان کی روح صدموں سے بے حال ہو گئی۔ وہ ایسے سالارِ کارواں بن کر رہ گئے جس کے ساتھ اسے غبارِ کارواں میں لپٹا چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔
انہوں نے شیخ حسّام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری کو جو مجلس کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ شیخ حسین شہید سہروردی سے مذاکرات کے لیے کراچی بھیجا۔ مؤقف یہ تھا کہ اگر سہروردی، قادیانیوں کو اقلیت قرار دلوانے کے لیے ہمارے فیصلے سے اتفاق کریں تو جماعت ان سے تعاون کے لیے تیار ہے۔
ابھی سفر کی گرد بیٹھی بھی نہیں تھی کہ اخبارات ان عجیب و غریب خبروں سے بھر گئے۔
"مجلس احرار کے رہنما شیخ حسّام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے آج اعلان کیا ہے کہ انہوں نے جناح عوامی لیگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ وہ جناح عوامی لیگ میں شامل ہو کر جمہوریت کی خدمت کر سکتے ہیں۔"
اس سے آگے بھی بہت کچھ لکھا تھا لیکن ان سے کچھ بھی نہیں پڑھا گیا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ بے اختیار منہ سے نکلا۔
"یاری توڑ گئے بکریاں والے۔ دو گھٹ دودھ بدلے۔"
(بکریوں کا دودھ دوہنے والے فقط دو گھونٹ دودھ کے لیے یارانہ توڑ گئے)
کچھ ساتھی ایسے تھے جو قافلے میں ان کے ساتھ چلتے چلتے حکمِ الٰہی سے ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ پھول مرجھا گئے،

خوشبو رہ گئی۔ یادیں رہ گئیں زخموں کے ذائقے رہ گئے۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حبیب الرحمٰن کی اموات نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ ان صدموں نے ان کی ایسی کمر توڑ دی کہ وہ اپنے امراض کو بھول گئے۔

"میں فالج اور ذیابیطس کا مریض نہیں ہوں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ میری محفلیں اجڑ گئی ہیں۔"

اب وہ مایوسیوں کی اس منزل پر تھے کہ انہیں خوشی کی خبر بھی صدموں کا لباس پہنے نظر آتی تھی۔ بظاہر ایک اچھی خبر اخبارات کے صفحوں کی زینت بنی تھی۔ حکومت نے ان پر دائر تمام مقدّمات واپس لے لیے تھے اور اس کے ساتھ ہی دوسری پابندیاں بھی اٹھالی تھیں۔

خبر خوشی کی تھی۔ احباب مبارک بادیں دے رہے تھے لیکن ان کی تیوریوں پر بل تھے۔ دوسرے دن عوام نے ان کا یہ بیان اخبارات میں پڑھا۔

"حکومت نے صرف میرے مقدّمات اور میری پابندیاں اٹھا کر میری سخت توہین کی ہے۔ حکومت کے اس اقدام سے مجھے بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ میری پوری زندگی میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ میرے ساتھی تو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں محبوس ہوں اور میں اکیلا جیل سے رہا ہو جاؤں۔ یہ بات میری جماعت کی تاریخ اور روایات کے خلاف ہے کہ حکومت صرف میرے مقدّمات واپس لے اور میرے تمام ساتھی مقدّمات میں جکڑے رہیں۔"

ان کے مقدمات واپس لے لیے گئے تھے لیکن پولیس برابر ان کی نگرانی کر رہی تھی۔ ادھر ان کا یہ حال کہ بیماری اور نقاہت نے بے حال کر رکھا تھا۔ کسی قسم کی سرگرمیوں سے معذور تھے البتہ دوستوں کے اصرار پر کبھی کبھی مقامی جلسوں میں آبیٹھتے تھے۔ اسی طرح کے ایک اجتماع میں جو 'تحفّظِ ختم نبوت کے تحت ہوا' تشریف لائے۔ پاؤں میں درد تھا۔ کسی نہ کسی طرح جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ صدارت بھی کی اور چند منٹ کی تقریر بھی کی۔

"عزیزو! اب مجھ میں وہ جان نہیں رہی۔ تمہیں گھنٹوں بٹھائے رکھوں۔ اب تو چراغِ سحر ہوں۔ اس ٹمٹماتے ہوئے دیے کی لو میں چند گھڑیاں بیٹھ کر اگر تمہیں زندگی کا کوئی نشان مل سکتا ہے تو اسے تلاش کرو۔

اس حالت میں بھی پولیس میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دن رات چوروں کی طرح میری نگرانی کرتی رہتی ہے مگر سی آئی ڈی کا ربوہ کی طرف کوئی دھیان نہیں۔ آج پھر کہتا ہوں کہ ربوہ کی خبر لو۔ ربوہ کا وجود پاکستان میں اسرائیل سے زیادہ خطرناک ہے۔"

وہ نقّار خانے میں آوازیں بلند کرتے رہے لیکن اثر الٹا ہوا۔ ابھی تک ان پر پابندی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں مجلس احرار کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اس اطلاع نے ان کے اوسان چھین لیے۔ ایک ایک سے پوچھتے تھے کہ مجلس کا قصور کیا تھا۔ کیا صرف یہ قصور تھا کہ ہم مذہب کے نام پر بنائے گئے ملک میں مذہب کا نام لے رہے تھے۔ کیا صرف یہ قصور تھا کہ ہم گستاخانِ رسولؐ کی زبانوں پر پابندی لگانے کی بات کرتے تھے۔ عصمتِ انبیا کی حفاظت کرنے کی سزا کیا معنیٰ؟

ان کی ذاتی ڈاک پر سنسر بٹھادیا۔ ان کے ٹیلی فون بھی ٹیپ کیے جانے لگے۔ وہ ضلع ملتان کے تبلیغی اجتماعات میں شرکت کیا کرتے تھے لیکن حکومت کی ان حرکتوں پر ایسے دم بخود ہوئے کہ یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اب لے دے کر حکیم حنیف اللہ کا مطب تھا جہاں وہ کسی کے سہارے سے چلے جاتے تھے یا گھر کی چار دیواری جہاں بیمار بیوی تھی۔ بیاہی بیٹی کبھی کبھی آجاتی تھی یا احباب جمع ہو کر ان کا دل بہلا جایا کرتے تھے۔

مایوسی نے انتہا کے زینوں کو چھوا تو وہ واپسی کی طرف رخ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ خود تو عمر کی اس منزل میں تھے جہاں امید اور ناامیدی یکساں ہو جاتی ہے لیکن انہیں دوسرے ساتھیوں کے مستقبل کی فکر تھی۔ آخر انہوں نے ایک تکلیف دہ فیصلے کی قندیل روشن کی اور احباب کے درمیان پہنچ گئے۔

"تمام کارکنوں کو میرا مشورہ ہے کہ اگر کوئی ملکی معاملات میں دلچسپی لینا چاہے تو مسلم لیگ میں شامل ہو جائے۔"

یہ ان کے ارادوں کی نہیں، ان کی عمر کی شکست تھی۔ 'نغمے کی تھکن نہیں' نے نواز کی نقاہت کا شاخسانہ تھا۔ بہت سے کارکنوں نے ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مسلم لیگ سے رجوع کیا لیکن لیگی رہنماؤں نے ان کے خلوص کو دُرخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور ان پر اپنے دروازے بند کر دیے۔ مجلس احرار کے لیے یہ نہایت مشکل گھڑی تھی۔ قافلۂ سالار بیمار تھا اور قافلہ مشکلات کے غبار میں گھرا ہوا تھا۔ ممکن ہے مجلس احرار ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتی کہ صوبائی وزیر اعلیٰ نے مجلس احرار پر سے تمام پابندیاں اٹھا لینے کا اعلان کر دیا۔

پابندی اٹھتے ہی شاہ جی کے مکان پر ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ شاہ جی کا فیصلہ اب بھی یہی تھا کہ مجلس کو

سیاست میں حصّہ نہیں لینا چاہیے لیکن اب وقت بدل گیا تھا للذا انہیں اپنے فیصلے میں بھی لچک پیدا کرنی پڑی۔

"میرا جی نہیں چاہتا کہ ان بکھیڑوں (سیاست) میں الجھوں لیکن میں آپ حضرات کو نہیں روکتا۔ میری دعائیں بہرحال آپ کے ساتھ ہیں مگر میری ایک ہی خواہش ہے کہ حضورؐ کی نبوت پر اس وقت جو ڈاکا پڑ رہا ہے آپ اس کا خیال رکھیں۔ بس میری یہی آرزو ہے۔ باقی آپ اپنے معاملات میں آزاد ہیں۔"

ابھی اس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کی تقریروں پر عمل درآمد شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ ملک ایک فوجی انقلاب سے دوچار ہو گیا۔ جنرل محمد ایوب خان نے صدر سکندر مرزا کو برطرف کرکے مارشل لا نافذ کر دیا۔ ملک کی نیّا جس طرح ہچکولے کھا رہی تھی، اس طوفان میں مارشل لا کی ناؤ غنیمت نظر آنے لگی۔ شاہ جی نے صرف اتنا تبصرہ کیا "گیارہ سال پیشتر سے جس طرح جوتیوں میں دال بٹ رہی تھی، اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔

جس مجاہد اور خطیب اعظم نے انگریزوں کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی، دین کی خدمت میں عمر بسر کر دی، وہ ابھی تک کرائے کے مکان ہی میں رہ رہا تھا۔ اس کی خدمات کے صلے میں اسے ایک مکان تک الاٹ نہ ہو سکا تھا۔ کئی دفعہ اخباروں میں شور مچا۔ کئی مرتبہ کوششیں ہوئیں لیکن صرف آنسو پونچھنے کی حد تک۔

ایک مرتبہ ایک مرکزی وزیر ان سے ملنے ملتان آئے۔ بڑے کروفر سے فرمایا "اگر آپ کہیں تو آپ کو ایک مکان الاٹ کرا دوں۔" شاہ جی چپکے ہو رہے تو نیم رضامند جان کر اس وزیر نے پھر فرمایا، فلاں تاریخ کو فلاں صاحب ملتان سے گزر رہے ہیں۔ ان سے مل لینا۔"

شاہ جی مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ وہ تاریخ آئی بھی اور چلی بھی گئی۔ شاہ جی کسی سے ملنے کہیں نہیں گئے۔ بہت دن تک وہ مزے لے لے کر اس قصّے کو سناتے رہے "بابو میرے پاس کالی اچکن اور قراقلی ٹوپی نہیں تھی۔ میں بڑے صاحب سے ملنے کیسے جاتا۔"

۱۹۵۸ء کے آخر میں انٹرنیشنل تبلیغی مشن، لندن کے سیکریٹری راؤ شیر علی نے انہیں لندن آنے کی دعوت دی۔ یہاں تک کہ خود انجمن کے افراد بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن اس سرفروش کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا۔

"جس انگریز نے ڈیڑھ سو برس میرے ملک کو غلام رکھا۔ اس کا خون چوسا اور جاتی دفعہ فتنہ وفساد کا ایسا تخم چھوڑ گیا کہ برّصغیر پاک وہند کے مابین کبھی امن قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسرے یہ کہ میں نے اپنی زندگی کے قریباً چالیس سال ان کی مخالفت کی ہے۔ اس بنا پر میرا ضمیر اس ملک میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔"

مجلس احرار سے پابندیاں اٹھ گئی تھیں لیکن ملتان کا دفتر ابھی تک سربہ مُہر تھا۔ شاید اس لیے کہ یہاں عطاءاللہ شاہ بخاری رہے' تھے۔

وہ اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھے اور برابر کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح ملتان کا دفتر واگزار ہو جائے۔ انہی کوششوں کے دوران میں ایک موقع ایسا آیا کہ جب ملتان کے ڈپٹی کمشنر مختار مسعود نے ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ ان کے ایک قریبی دوست نے جس سے شاہ صاحب کے مراسم بھی بہت گہرے تھے، وعدہ کر لیا کہ وہ عطاءاللہ شاہ کو ان کی کوٹھی پر لے آئے گا۔ شاہ جی سرکاری لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ تکلف کیا کرتے تھے لیکن کسی خیال سے تیار ہو گئے۔

شاہ جی حسبِ وعدہ پہنچے تو مختار مسعود نے کوٹھی سے باہر آکر ان کی پذیرائی کی اور نہایت احترام سے انہیں اندر لے کر گئے۔ کمرے میں ہمہ اقسام کے مشروبات سجے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کمرے کو بھی خاص ان کے لیے آراستہ کیا گیا تھا۔ مختار مسعود کو اس وقت سخت دھچکا لگا جب شاہ جی نے صرف سادہ پانی پینے پر اصرار کیا۔ مشروبات دھرے کے دھرے رہ گئے۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد آپ نے فرمایا "آپ کا حکم نامہ ملا تو سوچا، چلو اسی بہانے اپنا ایک کام ہی کرتا آؤں۔"

ڈپٹی کمشنر نے بڑی بے تابی سے کہا "فرمایئے۔"

شاہ صاحب نے چند کاغذات نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔

"سارے مغربی پاکستان میں تحفظِ ختم نبوت کے دفاتر حکومت نے واگزار کر دیے ہیں لیکن ملتان کا دفتر ہنوز سربہ مُہر ہے۔ اگر آپ یہ دفتر کھولنے کی اجازت دے دیں تو میں ممنون ہوں گا۔"

مختار مسعود یہ سمجھے ہوں گے کہ شاہ جی اس ملاقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے لیے پلاٹ یا مکان کا مطالبہ کریں گے لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا نکلا۔

"شاہ جی! یہ کام تو صوبائی حکومت کی پالیسی سے تعلق رکھتا ہے۔ میرے بس میں تو یہ ہے کہ میں آپ کو چھ سات

مربع اراضی دے سکتا ہوں اور اس میں ٹیوب ویل کا انتظام بھی کرا سکتا ہوں" ڈپٹی کمشنر نے کہا۔
"مختار صاحب! میں اپنی ذات کے لیے حاضر نہیں ہوا" شاہ جی نے کاغذ سمیٹتے ہوئے کہا "باقی رہے آپ کے مربع اور اس کی پیش کش تو اس کے لیے شکریہ۔"
مختار مسعود اس بے لوث رہنما کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے زندگی بھر اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں کیا حتیٰ کہ اپنی صحت کی طرف سے بھی بے پروا ہی رہے۔ کہنے کو علاج بھی چلتا رہا لیکن امیدوں کا قتل عام ہوا تھا۔ آرزوؤں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ان کے سینے میں ہزاروں چہروں کا ماتم بپا تھا۔ ایسے میں ہر علاج بے اثر ہوتا چلا گیا۔ ان کی صحت کو بڑے سہارے دیے جاتے رہے لیکن بہار کے زمانے کی رخصت کا پیغام آچکا تھا۔
ذہنی دباؤ نے اپنا اثر دکھایا۔ ان پر فالج کا ایک اور حملہ ہوا۔ اس سے پہلے ایک حملہ ہو چکا تھا لیکن یہ حملہ شدید تھا۔ پہلے حملے کے بعد معالج کے مطب تک جانے کی طاقت باقی رہ گئی تھی لیکن دوسرے حملے نے طاقت تو طاقت ہمت بھی چھین لی۔ اب گھر کی چاردیواری کے سوا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔
اس حملے کے بعد انہیں غالباً خود بھی احساس ہو گیا تھا کہ اب آخری وقت آن پہنچا ہے۔ ان کی گفتگو اب بے ربط جملوں کا مجموعہ بننے لگی تھی۔ کبھی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے تھے۔

داستان گو، اپنے شب بیداروں کو اٹک اٹک کر اپنی کہانی سنا رہا تھا کہ فالج کا تیسرا شدید حملہ ہوا۔ اس کا اثر زبان اور گلے پر ہوا تھا۔ زبان گفتگو سے عاری ہو گئی۔ گلا بند ہو گیا۔ جو زبان آٹھ آٹھ گھنٹے چل کر خاموش نہیں ہوتی تھی، ایک ایک لفظ کو ترسنے لگی۔ جس آواز سے مسجدوں کے درودیوار جھومنے لگتے تھے۔ جو آواز جلسہ گاہوں میں جنگل کے شیر کی طرح گونجتی تھی، خاموش تھی۔ سننے والے، کان منہ سے لگاتے تو کچھ الفاظ سمجھ میں آجاتے تھے۔
احباب کا مشورہ تھا کہ انہیں نشتر اسپتال میں داخل کرا دیا جائے لیکن وہ اپنے اتقا کی بدولت اسپتال جانے سے گریزاں تھے۔ کئی دن انہیں منانے میں گزر گئے بالآخر انہیں نشتر اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔
اخبارات نے شور مچایا۔ کالم لکھے گئے۔ نوٹ شائع ہوئے۔ یہاں تک کہ حکومت کو متوجہ ہونا پڑا۔ صدرِ مملکت محمد ایوب خان نے اسپتال کے انچارج کو ہدایت بھیجی۔

سیّد عطاءاللہ شاہ بخاریؒ کے انتقال کے ساتھ برِّصغیر پاک و ہند کی تحریکِ آزادی کا وہ زندگی افروز اور دل آویز باب ختم ہو گیا جس میں آزادی کی خاطر جسمانی اور روحانی صعوبتیں سہنا عبادت کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔
(احمد ندیم قاسمی)
حق یہ ہے کہ سیّد عطاءاللہ شاہ بخاریؒ پاک و ہند کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ قوم ایک مخلص رہنما سے محروم ہو گئی لیکن ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ انہوں نے قوم کو آزاد کرانے اور ملک کو ترقی کی منازل تک پہنچانے کے لیے جو کام کیا ہے، وہ دوسروں کے لیے مشعلِ ہدایت کا کام دے گا۔
(روزنامہ جنگ کراچی)
وہ شعلہ نوا خطیب اٹھ گیا جس نے ربع صدی تک سیاہ آزادی کا دل گرمائے رکھا۔ دنیائے خطابت کو اس پر ناز تھا اور اس کی یہ صلاحیت ملک و ملت کی خدمت کے لیے وقف رہی لیکن وہ صرف خطیب ہی نہیں تھا، عمل کا دھنی بھی تھا۔
(روزنامہ کوہستان، لاہور)
مرحوم جب یہ کہتے کہ میری تین چوتھائی زندگی ریل میں اور ایک چوتھائی جیل میں گزری تو حقیقت بھی یہی ہوتی تھی۔ وہ محض ایک سیاسی رہنما نہ تھے، ایک مکمل شخصیت تھے۔ مجاہد بھی اور رند بھی۔ جس طرح لاکھوں کے مجمع میں گرجتے، اسی طرح احباب کی محفل میں چہکتے۔ بزلہ سنجی اور خوش گفتاری سے ہر ایک کا دل مٹھی میں رکھتے۔ شعروادب کا مذاق نہایت پاکیزہ رکھتے تھے۔

(ہفت روزہ لیل و نہار، لاہور)

"حضرت شاہ صاحب کی صحت کا خیال کریں اور ان کے علاج پر پوری ذمے داری سے توجہ دیں۔ اگر پاکستان سے باہر بھی کسی معالج کی یا دوا کی ضرورت محسوس ہو تو فوراً درآمد کریں۔ نیز اس کا بل میرے نام گورنمنٹ ہاؤس بھیج دیں۔"
اس ہدایت کے بعد ان کا علاج اور زیادہ سرگرمی سے کیا جانے لگا۔ ہر وقت ڈاکٹرز ان کے گرد منڈلاتے رہتے۔ ذرا حالت بگڑتی تو اسپتال میں ہنگامی حالت کا سماں پیدا ہو جاتا۔

ڈاکٹر بشیر احمد ایک دن انہیں دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے معائنہ کیا اور ایک انجکشن تجویز کرکے چلے گئے۔ نرس نے انجکشن لگا دیا۔ اس انجکشن نے کچھ ایسا اثر دکھایا کہ نبضیں ڈوبنے لگیں۔ دل بیٹھنے لگا' تیماردار مطمئن تھے کہ وقتی تکلیف ہے' رفع ہو جائے گی لیکن حالت بگڑتی چلی گئی۔ شاہ جی نے اپنے خادم کو اپنے قریب بلایا اور نحیف آواز میں فرمایا "اس ٹیکے سے میرا کام ہو چکا ہے لہٰذا آپ گواہ رہیں" تین دفعہ کلمۂ شہادت پڑھا اور فرمایا "تمام دوستوں کو میرا سلام کہنا۔"

رات ایک بجے اسپتال کے انچارج کو اطلاع دی گئی۔ اس وقت تک آپ کے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ چکی تھی اور پیروں پر ورم آگیا تھا۔

انچارج نے یہ حالت دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیا۔ ڈاکٹر بشیر کو بھی بلایا گیا۔ دونوں کے درمیان سخت تلخ کلامی ہوئی۔ ایک غلط انجکشن نے شاہ جی کو موت کے قریب پہنچا دیا لیکن شکر ہے سانس چل رہی تھی۔ انچارج کے حکم پر فوراً دوسرا انجکشن لگایا گیا تو صبح ہونے تک طبیعت سنبھل گئی۔

کڑی نگرانی اور بہترین علاج نے انہیں موت کے منہ سے گھسیٹ لیا۔ اب ان کی طبیعت اتنی سنبھل گئی تھی کہ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ وہ کچھ دیر کے لیے کمرے سے باہر نکل کر چہل قدمی کیا کریں۔ وہ بادلِ ناخواستہ تیار ہوئے لیکن کمرے سے نکلتے ہی گردن اونچی کر لی۔

"عمر بھر دشمنوں کے سامنے سر اونچا کرکے چلتا رہا ہوں۔ آج اگر دشمنوں کو پتا چل گیا کہ میں بیماری کے باعث کمزور ہو گیا ہوں تو وہ خوش ہوں گے۔ اس لیے نقاہت کے باوجود چھاتی تان کر رکھنا چاہتا ہوں تاکہ دشمن سمجھے کہ بخاری ابھی زندہ ہے۔"

وہ اسپتال سے گھر منتقل ہو چکے تھے لیکن اب وہ ایک ایسے موڑ پر کھڑے تھے جہاں زندگی مستعار ملتی ہے۔ وہ بھی اسپتال سے کچھ سانسیں خرید کر گھر لے آئے تھے۔

حالت بگڑنے لگی تو ایک مرتبہ پھر ان کے احباب انہیں لاہور لے آئے۔ پورا لاہور انہیں دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا۔ ماڈل ٹاؤن کی جس کوٹھی میں انہیں ٹھہرایا گیا تھا وہاں سیاسی رہنماؤں' صحافیوں' ادیبوں' شاعروں اور عوام کی بھیڑ لگ گئی۔ وہ سب کو دیکھ رہے تھے لیکن بول نہیں سکتے تھے۔ لوگ آتے' ان کی چارپائی کے نزدیک کچھ دیر کھڑے ہوتے۔ ان کی زیارت کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔

ڈیڑھ مہینے تک یونانی اور انگریزی علاج ہوتا رہا لیکن جب کوئی افاقہ نہ ہو سکا تو انہیں پھر ملتان لے جایا گیا۔ یہاں پہنچ کر بھی ڈاکٹروں اور حکیموں کے تمام نسخے بے کار ہو گئے۔ وہ چارپائی پر بے حس و حرکت پڑے' اپنے خالق کے فیصلے کے منتظر تھے۔

انہیں ملتان آئے ہوئے پچیس روز ہوئے تھے کہ ایک رات اچانک سانس نے ہچکولے کھانے شروع کر دیے۔ موت کے سائے در و دیوار پر ناچنے لگے۔

شاہ جی پر بے ہوشی طاری تھی اور رات آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ دن نمودار ہوا تو پورا ملتان شہر ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔

دن کب گزر گیا خبر ہی نہیں ہوئی۔ مؤذن نمازِ مغرب کی اذان کے لیے اٹھا ہی تھا کہ چھ بج کر پچپن منٹ پر عطاءاللہ شاہ بخاریؒ کی زندگی کی شام ہو گئی۔

دن بھر ملتان کے شہری امیدوں کے گلدستے لے کر آتے رہے تھے۔ شام ہوئی تو آنسوؤں کے نذرانے لے کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ کراچی سے پشاور تک کے لوگ جنازے میں شریک ہونے کے لیے ملتان پہنچنے لگے۔ دیہاتیوں کی ٹولیاں پیدل چل پڑیں۔ تانگے' لاریاں' سائیکل' جس کو جو سواری ملی' سوار ہوا اور ملتان کی طرف دوڑ پڑا۔

۲۲ اگست ۱۹۶۱ء کو نمازِ ظہر کے بعد جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو دو لاکھ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جنازے کے ساتھ تھا۔ نمازِ عصر کے بعد ان کی نمازِ جنازہ ان کے فرزندِ اکبر سیّد عطاء المنعم شاہ بخاری نے پڑھائی۔

تدفین کے لیے شہر کے تاریخی قلعے میں جگہ دیکھ لی گئی تھی۔ حکومت سے منظوری بھی مل گئی تھی لیکن عین وقت پر ان کی بیوی نے قلعے کو ان کی آخری آرام گاہ بنانے کی شدید مخالفت کی۔

"جو شخص عمر بھر حکومت کے کسی اعزاز کا احسان مند نہیں ہوا۔ اسے حکومت کی اجازت سے حاصل کردہ جگہ پر دفن کرکے اس کی روح کو صدمہ پہنچانا بہتر نہیں۔"

یہ پیغام ملتے ہی ان کا جنازہ بھاکری قبرستان لے جایا گیا۔ سورج نے جاتے جاتے یہ دلدوز منظر دیکھا اُدھر امیرِ شریعتؒ کا جسدِ خاکی مٹی کے نیچے چھپا' اِدھر سورج نے اندھیرے کی چادر اوڑھ لی۔

ماخذ: اس کہانی کی ترتیب میں واقعات و حالات' حیاتِ امیرِ شریعت مؤلفہ جانباز مرزا سے لیے گئے ہیں۔